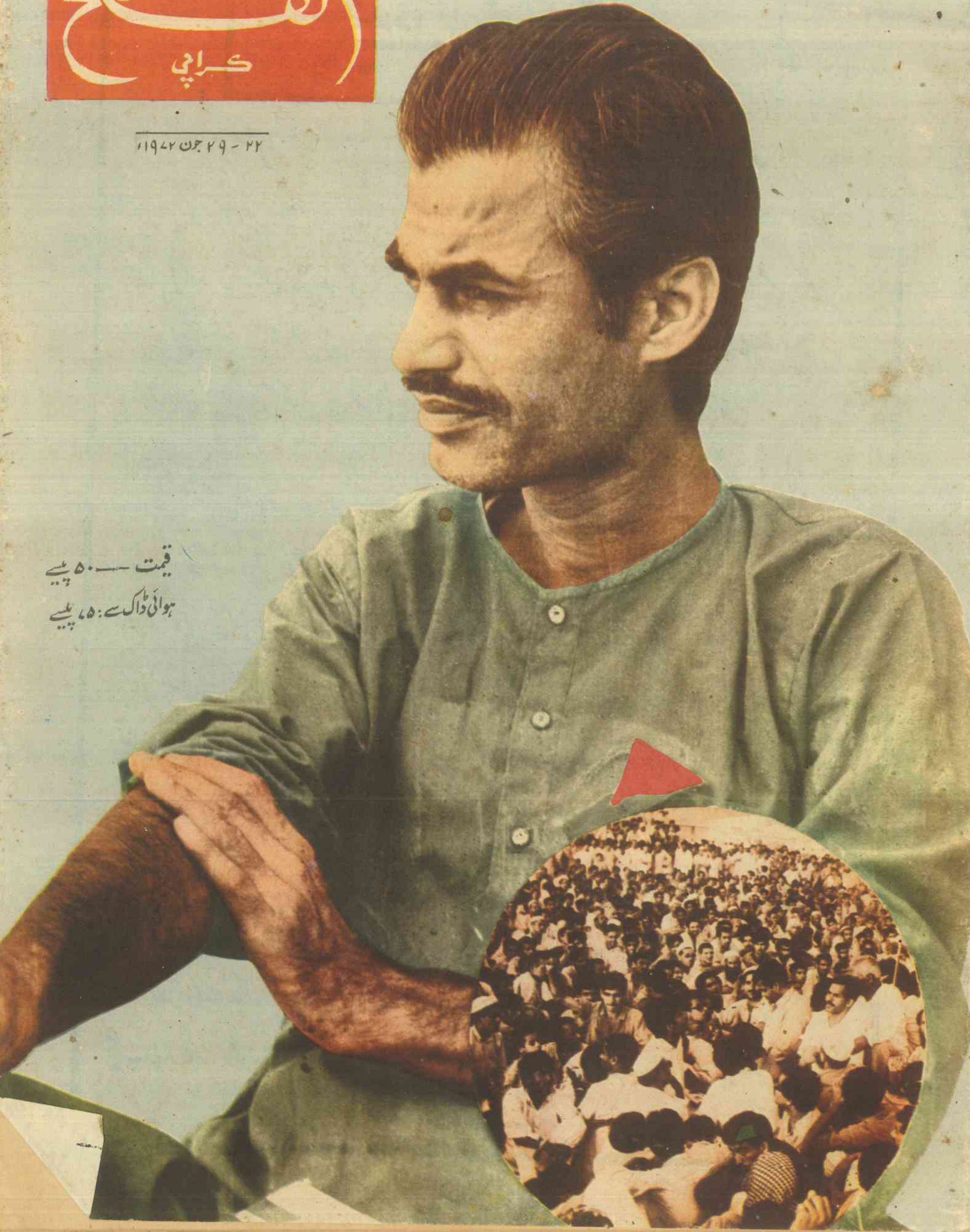
ہفت روزہ الفتح کراچی

۲۲ - ۲۹ جون ۱۹۷۲ء



قیمت ـــــ ۵۰ پیسے

ہوائی ڈاک سے: ۷۵ پیسے

فیصلے کی گھڑی آگئی

میرے مجبور محنت کشو

خون میں ڈوبتے، ظلم سہتے ہوئے ساتھیو
بھوک کی گود میں سانس لیتے ہوئے شہریو !
گلیوں کوچوں میں بے کار پھرتے ہوئے نوجوانو سنو !
حسرتوں سے بھری زرد آنکھیں لیے میری بہنو سنو !

اپنے سینوں میں
بیٹوں کی ابدی جدائی کے صدمے لیے میری ماؤں سنو !
دشمنوں میں گھرے دوستوں میں پھنسے میرے محکوم و معصوم فاقہ کشو !
کتنی صدیوں سے لٹتی ہوئی عصمتو !
کتنی نسلوں سے بکتی ہوئی غیرتو !
کتنے برسوں سے جلتی ہوئی حسرتو !
فیصلے کی گھڑی آگئی
فیصلے کی گھڑی آگئی

اِک طرف ظلم ہے، اِک طرف عزم ہے
اک طرف قہر ہے، اِک طرف درد ہے
ایک دیوار ہی بس گری ہے ابھی

صرف منزل جھلکنے لگی ہے ابھی
کون کیا ہے —— یہ ہم جاننے تو لگے
لوگ آپس میں پہچاننے تو لگے
اب یہی روشنی اور یہی آگہی
ہر قدم، ہر نظر رہبر و رہنما
اب فریبِ نظر نہ سراب عمل
فیصلے کی گھڑی آگئی
فیصلے کی گھڑی آگئی

اپنے ہاتھوں میں اب اپنی تقدیر ہے
جب تلک ظلم کا ہر نشاں نہ مِٹے
جب تلک قہر کی رات باقی رہے
اس وطن پر تباہی کے سائے رہیں
ہموطن —— ہمسفر اجنبی سے رہیں
جب تلک لفظ معنی سے بچھڑے رہیں
جاگتے ہی رہو، جاگتے ہی رہو
میرے مجبور فاقہ کشو، میرے بیدار محنت کشو

محمود شام

(از مستقبل)

الفتح

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

هفت روزه
الفتح
کراچی

جلد: ۳ —— شمارہ: ٦

۲۲ - ۲۹ جون ۱۹۷۲ء

نگران
شوکت صدیقی

مدیر
ارشاد راؤ

نائب مدیر
وہاب صدیقی

سرورق :- الطاف رانا

بدل اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	سہ ماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے:	۵،۱ پیسے	۳۰ روپے	۱٦ روپے

بحرین، کویت :- ٦۰ فلس ۔ دوبئی، قطر: ۵،۰ درم
سعودی عرب :- ۵ قرش ۔ انگلستان ۲ شلنگ ٦ پنس

مقام اشاعت
ہفت روزہ "الفتح"، ۷/۸ - ڈی نرسری کمرشل ایریا
پی ای - سی ایچ - ایس —— کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر: ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد - کراچی

ٹیلیفون : ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

چوروِی آکھن ...

کراچی کے پُرامن اور نہتے مزدوروں پر دوبار پولیس فائرنگ کے نتیجے میں ہونے والی صنعتی ہڑتال ختم ہو چکی ہے۔ یہ سانحہ اتنا بڑا ہے کہ مزدور تحریک میں کام کرنے والے سیاسی کارکنوں، مزدور رہنماؤں اور خود باشعور اور بہادر مزدور طبقے کو اس کا سائنسی بنیادوں پر تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ جو ساتھی لکھنے پڑھنے کی صلاحیتوں سے محروم ہیں۔ لازم ہے کہ ان سے فوری رابطہ قائم کیا جائے اور اس گھناؤنی سازش سے آگاہ کیا جائے۔ جس کی وجہ سے ہم اپنے انتہائی عزیز ساتھیوں، صفِ اوّل کے ٹریڈ یونین، کے کارکنوں اور بہادر رفیقوں سے نہ صرف محروم ہو گئے ہیں بلکہ وہ خطرہ بہت نزدیک آ پہنچا ہے جس کی توقع پیپلز پارٹی سے اتنی جلد نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ یقین اپنی جگہ موجود تھا کہ بائیں بازو کو ختم کرنے میں پیپلز پارٹی کا جاگیردار حکمران فعال کوششیں کرے گا۔ لیکن وہ اپنے اور پارٹی کے تضادات کی وجہ سے کچھ دن صبر سے کام لے گا۔ یہ غلط ثابت ہوا۔ جونہی جے۔ اے۔ رحیم اور مولانا کوثر نیازی نے اپنی پارٹی میں بائیں بازو کے دیانتدار، بے لوث اور بے غرض کارکنوں کو تختۂ مشق بنانا شروع کیا، الفتح نے بے دھڑک یہ کہہ دیا تھا کہ اس جال سے بچیں جو پیپلز پارٹی کا کنونشنی اور خفیہ اشاروں پر ناچنے والا عنصر پھیلا رہا ہے۔ یہ قابلِ تحسین بات ہے کہ کارکنوں نے اسے بھانپ لیا۔ مرکزی سیکرٹریٹ پر قبضے کا پلان بنانے والے کارکنوں کے غلط اقدام کے بعد کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پیپلز پارٹی ایک کثیرالطبقاتی جماعت ہے۔ اس میں سندھ میں جاگیردار چھائے ہوئے ہیں۔ پنجاب میں اگرچہ درمیانے طبقے کے لوگوں کی اکثریت کامیاب ہوئی۔ لیکن اب یہاں بھی سہگلوں نے شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔ بائیں بازو کے کارکنوں کی اکثریت ناقص تربیت کی وجہ سے بعض حزکاروں کے اشاروں پر اس پارٹی میں بیگار کرتی رہی۔ اس جبری مشقت کو نام نہاد بائیں بازو کے ٹھیکیداروں نے کیش کیا اور جب وہ حکمران جاگیردار کے ساتھ اندر بیٹھ گئے تو انتہائی عیاری اور مکاری سے بائیں بازو کے کارکنوں کو سنگل آؤٹ کرنا شروع کر دیا گیا۔ اس طرح پیپلز پارٹی پر خالصتاً معیشت پسندوں جاگیرداروں اور ان کے ایجنٹوں کا قبضہ ہو گیا اور وہ عوام میں برملا کہنے لگے کہ جنہیں سیکرٹری جنرل جے۔ اے۔ رحیم مکھیوں کی طرح سے نکال رہے ہیں، سوشلسٹ نہیں، سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں۔

شاید ایوب اور یحییٰ کی طرح صدر بھٹو کے وزیر اور صلاح کار یہ سوچے بیٹھے ہیں کہ عوام بیوقوف ہوتے ہیں انہیں جس ڈگر پر چلاؤ یا ہانکو، اسی پر چل نکلتے ہیں۔ ایسے اقتدار میں یہ سوچ لازمی ہے لیکن کارکنوں کو سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہنے والوں نے عملی طور پر یہ کیا کہ ولیکا، داؤد کو رہا کر دیا۔ اور مزدوروں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ جیلیں بھرنے لگیں۔ لائلپور میں ایک سرمایہ دار قتل ہوا تو مختار رانا کا حشر کر دیا گیا۔ سن شائن، سیون اپ، دھابیجی، کوٹری اور کراچی میں پولیس اور مالکوں نے بندوقوں کے دھانے کھول دیئے۔

ایک طرف یہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف کوثر نیازی کی وزارت چیخ رہی تھی: "بچاؤ، جلاؤ اور گھیراؤ سے۔" یہ شرمناک ڈرامہ محض اس سازش کو مکمل کرنے کے لئے اسٹیج کیا جا رہا تھا جو ۷ اور ۸ جون کو کراچی میں ننگی ہوئی۔ اور ہر چہ دلاور است دزدے کے مصداق اس بربریت کا نشانہ بننے والوں کے بارے میں ارشاد ہوا کہ یہ لوگ روس اور بھارت کے ایجنٹ ہیں۔ بیرونی سازش کو مکمل کر رہے ہیں۔

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

نئے مرکزی ٹیکس - ایک نظر میں

وزیرِ خزانہ نے ۷۳-۱۹۷۲ء کے لیے ٹیکسوں کے جن اقدامات کا اعلان کیا ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(۱) پرسنل الاؤنس، تعلیم الاؤنس اور سفر الاؤنس کو یکجا کر کے تین ہزار روپے کا ایک الاؤنس کر دیا گیا ہے یہ سہولت تنخواہ پانے والوں کے لیے ہے دیگر افراد کے لیے یہ رقم دو ہزار روپے ہے۔

(۲) تنخواہ یافتہ ٹیکس دہندگان اب "ارنڈ انکم ریلیف" کی مد میں تنخواہوں سے ڈھائی ہزار روپے منہا کر سکیں گے کاروبار اور پیشوں سے آمدنی والے افراد کے لیے یہ رقم ایک ہزار روپے مقرر کی گئی ہے۔

(۳) سرمایہ کاری کا الاؤنس بیس فیصد سے بڑھا کر تیس فیصد کر دیا گیا ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ رقم دس ہزار کے بجائے اب بیس ہزار روپے ہوگی۔ ٹیکس کی چھوٹ حاصل کرنے کے لیے اب لائف انشورنس پالیسی تین سال کے لیے اور این آئی ٹی یونٹ پندرہ ماہ کے لیے رکھنا لازمی ہے۔ ایمپلائر کی ادا کی ہوئی رقم کو نہ تو آمدنی تصوّر کیا جائے گا نہ سرمایہ کاری الاؤنس کے لیے شمار کیا جائے گا۔

(۴) ڈیویڈنڈ کی آمدنی اب دو ہزار روپے کی حد تک مستثنیٰ ہوگی۔ این آئی ٹی اور آئی پی سی کے سلسلے میں مزید دو ہزار روپے کا ڈیویڈنڈ ٹیکس سے ہوگا۔ ٹیکس ہالی ڈے والی کمپنیوں کا ادا کیا ہوا منافع دیگر منافعوں کی طرح قابلِ محصول ہوگا۔

(۵) خیراتی اداروں کو دی جانے والی رقم ۵ فیصد تک محدود ہوگی جو دو لاکھ سے زائد نہ ہونی چاہیئے۔ یہ پابندیاں کمپنیوں کے لیے ہے۔ دیگر صورتوں میں یہ حد دس فیصد تک ہے جبکہ زیادہ سے زیادہ رقم ایک لاکھ روپے ہے۔

(۶) صرف چھوٹے رہائشی مکان جن کی سالانہ آمدنی چھ ہزار روپے سے زائد نہ ہو ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

(۷) ایمپلائرز کی فراہم کی ہوئی مفت رہائش کو ملازم کے ہاتھ میں آمدنی تصوّر کیا جائے گا اس کی صورت یہ ہوگی

(الف) غیر آراستہ : تنخواہ کا دس فیصد

(ب) آراستہ : تنخواہ کا پندرہ فیصد

(ج) آراستہ اور ایمپلائرز کے صَرفے سے دیکھ بھال ہونے کی صورت میں تنخواہ کا ۲۰ فیصد۔

(۸) فرموں کے رجسٹریشن کا نظام ختم کر دیا جائے گا اور تمام فرموں پر معیاری انفرادی انکم ٹیکس کی شرحوں کے مطابق ٹیکس لگائے جائیں گے۔ رجسٹرڈ فرموں پر سے سپر ٹیکس اٹھا لیے گئے ہیں۔ ایسے پیشہ ور افراد کی پارٹنرشپ کی صورت میں جو انکارپوریٹ نہیں ہو سکتے۔ حصہ داروں پر ان کے حصص کی بنیاد پر علیحدہ علیحدہ ٹیکس لگایا جائے گا

(۹) بینکوں سے ۲۵ فیصد کی شرح سے سپر ٹیکس وصول کیا جائے گا۔

(۱۰) غیر منقسم منافعوں پر سے ٹیکس واپس لے لیا گیا ہے

(۱۱) پرائیویٹ کمپنی پر اسے حاصل ہونے والے منافعوں پر عام کمپنی ریٹ کے مطابق ٹیکس وصول کیا جائے گا پبلک کمپنی کے انٹر کارپوریٹ منافع پر پندرہ فیصد کے رعائتی ٹیکس کی شرح برقرار رہے گی۔

(۱۲) ٹیکس سے چھوٹ کا طریقہ سابقہ مدّت سے تشخیص کے سال ۷۲-۱۹۷۱ء سے ختم کر دیا گیا ہے

(۱۳) فرسودگی الاونس کی غرض سے اثاثہ کی از سرِ نو تشخیص کی اجازت دے دی گئی ہے۔ روپے کی قیمت میں کمی کے سبب بیرونی قرضوں میں اضافہ کو پلانٹ اور مشینوں کی تشخیص شدہ مالیت میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

دوم : ایسٹیٹ (املاک) ڈیوٹی

(۱۴) ایسٹیٹ ڈیوٹی کی انتہائی پچاس فیصد شرح (جس کا اطلاق ۲۵ لاکھ روپے سے زائد کی املاک پر ہوتا تھا) بڑھا کر ۶۵ فیصد کر دی گئی ہے جو پچاس لاکھ روپے سے زائد مالیت کی املاک پر عائد ہوگی۔

(۱۵) وہ تحائف جو کسی معطی نے اپنی موت سے پانچ سال قبل کے عرصہ میں دیئے ہوں گے ان پر ایسٹیٹ ڈیوٹی عائد ہوگی۔ اگر تحفہ ٹیکس ادا کیا جا چکا ہوگا تو اسے ایسٹیٹ ڈیوٹی کے مطالبہ سے منہا کر دیا جائے گا۔

سوم : دولت ٹیکس

(۱۶) دولت ٹیکس کی موجودہ شرحیں جو ایک فیصد سے تین فیصد تک ہیں، دوگنی کر دی گئی ہیں اس کی زیادہ سے زیادہ حد ۵ فیصد ہوگی۔

(۱۷) فن پارے، ڈرائینگز، پرنٹس یا سائنسی ذخائر جو فروخت کے لیے نہیں ہوں گے مستثنیٰ قرار دے دیئے گئے ہیں۔

چہارم : سیلز ٹیکس

(۱۸) مینوفیکچررز لائسنس کا نظام ختم کر دیا گیا ہے۔ خام مال پر جو سیلز ٹیکس ادا کیا جاتا تھا وہ اب تیار مال پر عائد ہونے والے سیلز ٹیکس میں شامل کر دیا جائے گا۔

(۱۹) زیورات پر سیلز ٹیکس ختم کر دیا گیا ہے اس کے بجائے صرافے کے کاروبار سے حاصل ہونے والی اصل آمدنی پر چھ فیصد شرح سے سرچارج لگا دیا گیا ہے۔

(۲۰) مقامی طور پر تیار ہونے والے کاغذ پر سے سیلز ٹیکس کی شرح بیس فیصد سے کم کر کے دس فیصد کر دی گئی ہے۔

پنجم : سنٹرل ایکسائز

(۲۱) پٹرول پر ڈیوٹی کی شرح میں ایک روپیہ فی گیلن کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

(۲۲) سگریٹ پر لگائے جانے والے سرچارج میں

باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ فرمائیں

مرکزی بجٹ ایک نظر میں

کل آمدنی	آٹھ ارب ۵۱ کروڑ روپے
آمدنی کے وسائل میں کمی	۵۴ کروڑ روپے۔
غیر ترقیاتی اخراجات	سات ارب اٹھارہ کروڑ روپے
ترقیاتی اخراجات	چار ارب پندرہ کروڑ روپے
نئے ٹیکسوں سے آمدنی	۲۶ کروڑ روپے
ریل کے کرایوں میں اضافہ سے آمدنی	چار کروڑ روپے
خسارے کی سرمایہ کاری	پندرہ کروڑ روپے
ترقیاتی اخراجات کے لیے ملکی وسائل سے آمدنی	۶۹ کروڑ روپے
غیر ملکی امداد	تین ارب ایک کروڑ روپے
محاصل اور دوسرے ذرائع سے آمدنی	تین ارب ۵۷ کروڑ روپے

احوال واقعی

پیپلز پارٹی

اسلام پسندوں کا "جدید ایڈیشن"

واقفِ حال

صورت حال یہ ہے کہ ملک اپنی تاریخ کے ایک اہم مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ مشرقی پاکستان میں انقلابی عوام نے عوامی لیگ کے موقع پرستوں اور بھارتی توسیع پسندوں کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کر دی ہے۔ مجیب حکومت کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے۔ وہ شکست خوردگی کا شکار ہو کر ظلم و تشدد پر اتر آئی ہے۔ اور کلکتہ کے مارواڑیوں کے سرمائے اور بھارتی فوجوں کے ذریعے عوام کی اس مسلح جدوجہد کو کچل دینا چاہتی ہے۔ مگر اپنی اس کوشش میں وہ بری طرح ناکام ہو رہی ہے۔ عوامی قوتیں روز بروز مستحکم ہوتی جا رہی ہیں۔

عوامی لیگ کی شکست خوردگی اور انقلابی قوتوں کی طاقت کا اندازہ صرف ایک تازہ ترین واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اور وہ واقعہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں مجیب حکومت، بھارتی فوجیوں کی مدد سے ایک مسلح تصادم میں مشرقی پاکستان کے انقلابی رہنما عبدالمتین کو جو شدید زخمی ہو چکے تھے، گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ انہیں جب ایک ہیلی کوپٹر کے ذریعے ڈھاکہ لایا گیا تو یہ خبر آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی عوام نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا۔ پچاس ہزار سے زیادہ نوجوان سرخ جھنڈے اٹھائے ایئرپورٹ پر پہنچ گئے۔ انہوں نے متین کی رہائی اور عوامی لیگ کی مذمت میں نعرے لگائے۔ صورتِ حالات اس قدر کشیدہ ہو گئی کہ ہیلی کاپٹر ڈھاکہ ایئرپورٹ پر نہ اتر سکا۔ اسے مجبوراً فوجی چھاؤنی کے علاقے کرمی ٹولہ میں اتارا گیا۔ جہاں اب وہ بھارتی فوج کی نگرانی میں نظر بند ہیں۔ زبردست حفاظتی انتظامات ہیں اور عوام میں بےچینی اور کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ ڈھاکہ شہر کی دیواروں پر لاتعداد ایسے پوسٹر نظر آتے ہیں جن میں حکومت کو خبردار کیا گیا ہے کہ اگر متین کے خلاف کوئی بھی انتقامی کارروائی کی گئی تو عوامی لیگ کے تمام رہنماؤں کو چن چن کر قتل کر دیا جائے گا۔

مغربی پاکستان کی صورتِ حالات بھی مشرقی پاکستان سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔ یہاں بھی مزدور، کسانوں، طالب علموں اور ناانصافی کے شکار دوسرے طبقات کے اتحاد سے اپنی جدوجہد کا آغاز کر چکے ہیں۔ دوسری طرف وڈیروں، اگماشتہ سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے سیاسی جماعتوں میں خفیہ جوڑ توڑ ہو رہی ہے۔ عوام کو ان کے بنیادی مسائل سے گمراہ کرنے کے لئے نت نئے سیاسی حربے استعمال کئے جا رہے ہیں۔

دائیں بازو کی جماعتیں جنہوں نے ہمیشہ عوام سے غداری کی ہے اور استحصال کرنے والوں کے ہاتھ مضبوط کئے ہیں۔ ایک بار پھر اپنے زنگ آلود اور فرسودہ ہتھیار لے کر میدان میں آ گئی ہیں۔ جماعت اسلامی کو ایک بار پھر اسلام اور نظریہ پاکستان خطرے میں نظر آنے لگا ہے۔ ملک کی سالمیت اور استحکام کا درد تڑپانے لگا ہے۔ اتفاق سے ادھر اس کے ہاتھ میں دو سیاسی حربے بھی آ گئے ہیں۔ اُن میں ایک ہے ڈاکٹر نذیر کا قتل۔ یوں آئے دن قتل ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سیاسی کارکن بھی ہوتے ہیں لیکن جماعت اسلامی کا جو بھی کارکن مارا جاتا ہے۔ وہ فوراً شہید کا منصب پاتا ہے۔ چاہے وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کا طالب علم عبدالمالک ہو یا ڈیرہ غازی خان کے ایم۔ این۔ اے ڈاکٹر نذیر ہوں۔

مردہ شوئی جماعت اسلامی کا پرانا سیاسی پیشہ ہے۔ سو آج کل وہ ڈاکٹر نذیر کا سوگ مناتی ہے۔ جلسے کرتی ہے۔ جلوس نکالتی ہے جن کی قیادت مشہور زمانہ اسلام پسند نواب زادہ شیر علی خاں کرتے ہیں۔ جماعت کی صفوں میں کہرام برپا ہے۔ ہائے ڈاکٹر نذیر ہائے ڈاکٹر نذیر! جن لوگوں نے ڈاکٹر نذیر کو قتل کیا۔ انہوں نے ایک انسان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے، ایک بھیانک جرم کیا۔ مگر جماعت پر بڑا احسان کیا۔ اُسے سیاسی واویلا کرنے کے لئے ایک حربہ دے دیا کہ چند روز اپنی سیاسی دُکان چمکا لے۔

بہاریوں کو مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان لانے کا سیاسی حربہ جماعت اسلامی کے پاس پہلے ہی تھا۔ اب اردو کا درد بھی اسے ستانے لگا ہے۔ جی ایم سیّد نے عوام کو بنیادی مسائل سے گمراہ کرنے اور سندھ کی وڈیرہ شاہی کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے سندھی اردو کا جھگڑا کھڑا کیا۔ جماعت تو ایسے عوام دشمن جھگڑوں کی تاک میں رہتی ہی ہے۔ اس نے فوراً اردو کا جھنڈا بلند کیا۔ مہاجرین کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کراچی میں اردو کی حمایت میں مظاہرہ کرایا۔ بڑا بڑا سکّہ بند دانشور اس میں شریک ہوا۔ ان میں سابق داروغۂ جامعہ میجر آفتاب حسن بھی تھے اور اسلام پسندوں کے اتالیق ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بھی تھے۔ جب تک یہ دونوں جامعہ کراچی میں رہے جامعہ جماعتِ اسلامی کا قلعہ بنی رہی، گئے تو بارودی سرنگیں بچھا گئے جو جامعہ کے گزشتہ کانووکیشن کے موقع پر گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور کے خلاف پھٹیں۔ یہ اسلام پسند مہربان آجکل اردو پر مہربان ہیں اب اُردو کا خدا ہی حافظ!

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔

جمعیت العلمائے پاکستان کو بھی اپنا جھنڈا اونچا کرنے کے لیے ایک حربہ مل گیا۔ سندھی کے چند مہم جو طلباء نے عثمان کینیڈی کو زدوکوب کر دیا۔ چوٹ کچھ زیادہ ہی آئی جب ہی تو وہ ہسپتال میں داخل ہوئے۔ اب کراچی میں زیر علاج ہیں کینیڈی جمعیت العلما کے ایم پی اے ہیں۔ کبھی طالب علموں کے لیڈر تھے، کیسے لیڈر تھے یہ نہیں معلوم۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ طلباء ان کے نام سے بدکتے تھے اور عثمان کینیڈی کی بجائے انہیں عثمان نکسن نام رکھنے کا مشورہ دیتے تھے۔

غرضیکہ عثمان کینیڈی زخمی ہوئے اور جمعیت العلمائے پاکستان کو بھی جماعت اسلامی کی طرح بیان بازی کرنے اور پریس کانفرنس منعقد کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ اسلام پسندوں کا نقیب کراچی کا "سب سے زیادہ چھپنے والا" اخبار ان بیانات کو، ان خبروں کو بمعہ تصاویر اس آب و تاب سے ہر صبح چھاپتا ہے جیسے یہ کوئی قومی سانحہ ہے، قوم پر قیامت پھٹ پڑی ہے اور عثمان کینیڈی ان خبروں کو دیکھتے ہیں تو دعائیں مانگتے ہیں کہ ان کے ساتھ روز روز ایسے حادثات پیش آئیں اور روز روز ایسی مفت کی پبلسٹی ہاتھ آئے۔

مسلم لیگ کے تینوں دھڑوں کا حال یہ ہے کہ وہ "تھالی کے بینگن" کی طرح اِدھر سے اُدھر لڑھکتے پھر رہے ہیں۔ قیوم لیگ نے پیپلز پارٹی سے گٹھ جوڑ کر لیا اور کونسل لیگ اور کنونشن لیگ سرحد میں نیپ کا دامن تھامے اس آس میں ہیں کہ شاید کوئی وزارت یا سفارت مل جائے۔ کونسل لیگ کے میاں ممتاز دولتانہ برطانیہ میں پاکستان کے سفیر بن چکے ہیں۔ اب

بائیں بازو کے عناصر کے خلاف کوثر نیازی کی مہم

سردار شوکت حیات اس انتظار میں ہیں کہ پیپلز پارٹی سے تو کچھ نہیں ملا تو نیپ ہی انہیں کچھ دے دے۔ کوئی عہدہ کوئی منصب: اس میں ان کا کوئی قصور بھی نہیں۔ دراصل مسلم لیگ کی سیاست جاگیرداروں کی سیاست ہے جو وزارتوں اور عہدوں کے گرد طواف کرتی ہے ڈرائینگ روموں میں پروان چڑھتی ہے اور سرمایہ دار پریس میں خبروں کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

"تحریکِ استقلال" نام ہے اصغر خان کا، اور اصغر خان نام ہے سیاسی قلابازیوں کا۔ کبھی وہ کہتے ہیں ــــ "بنگلہ دیش کو تسلیم کرو، کبھی کہتے ہیں نہ کرو" ان کی سیاست ہوا کے رُخ کے ساتھ بدلتی ہے۔ بقول شخصے ــــ "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" تحریکِ استقلال کے سیکرٹری جنرل، ملک غلام جیلانی ریس میں گھوڑے دوڑاتے ہیں اور سیاست لڑاتے ہیں۔ جب ریس میں ہارتے ہیں فوراً ایک جلا بھنا بیان داغتے ہیں۔ ریس کھیلنے والے ان کے بیانات سے ان کی کم یا زیادہ ہار کا اندازہ لگاتے ہیں۔

پی۔ڈی۔پی، نورالامین کے نائب صدر ہونے کے بعد لاوارث ہو چکی ہے۔ لے دے کے نوابزادہ نصراللہ خاں رہ گئے ہیں وہ حقہ گڑگڑاتے ہیں اور منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی کبھار ایک عدد اخباری بیان جاری کر دیتے ہیں تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔

یہ تو دائیں بازو کی جماعتوں کا حال ہے۔ کام ان کا سیاسی شعبدہ گری ہے۔ عوام کو ان کے بنیادی مسائل سے گمراہ کرنا ان کا پیشہ اور وڈیروں اور نوکر شاہی کے ہاتھ مضبوط کرنا ان کا نصب العین ہے لہذا ان کا سیاسی کردار جو کل تھا آج بھی ہے۔ عوام کے بنیادی مسائل سے نہ انہیں کبھی پہلے تعلق تھا اور نہ اب ہے۔ یہ جماعتیں عوام کو صرف عوام کے نام پر گمراہ کرنے کے فن میں ماہر ہیں۔ لہذا ایسے ایسے مسائل تلاش کر کے لاتی ہیں جن کا معاشرے کے بنیادی ڈھانچے کی تبدیلی سے کوئی واسطہ نہیں۔

لیکن وہ جماعتیں جو خود کو بائیں، بازو کی جماعتیں کہتی ہیں اور جنہوں نے دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں بنیادی معاشرتی تبدیلیوں اور عوام کی زندگی کو بہتر بنانے کے نام پر ووٹ حاصل کیے تھے۔ برسرِ اقتدار آنے کے بعد وہ بھی اپنے اتفاقی تضادات کا شکار ہو گئیں ــــ یہ جماعتیں ہیں نیپ اور پیپلز پارٹی۔

نیپ، جمعیت العلمائے اسلام، کونسل اور کنونشن لیگ کے گٹھ جوڑ سے کسی نہ کسی طرح معمولی اکثریت سے سرحد اور بلوچستان میں مخلوط وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ جب اس نے انتخابات میں حصہ لیا تھا تو دھوم دھام سے اعلان کیا تھا کہ وہ پاکستان میں سوشلسٹ معاشرہ قائم کرے گی۔ مذہب کے نام پر ہونے والی جاگیروں اور سرمایہ داروں کی سیاسی دلالی ختم کرائے گی۔ ملک میں ایک سیکولر نظام قائم کرے گی۔ مگر اقتدار کی ہوس میں اس نے اپنے منشور کے سارے اصول، سارے مقاصد پس پشت ڈال دیئے۔ پشاور اور کراچی کے سرمایہ داروں جاگیرداروں اور بلوچستان کے سرداروں سے اپنا سیاسی رشتہ جوڑا اور جمعیت العلماء کو اپنا امام بنالیا۔ اب سرحد کی حالت یہ ہے کہ حکومت جمعیت کی ہے اور سیاست نیپ کی۔ کبھی شراب پر پابندی عائد ہوتی ہے کبھی جہیز پر اور کبھی جماعتِ اسلامی کی طرح اسلامی آئین کا نعرہ بلند ہوتا ہے سرحد کے عوام کہتے ہیں ہم بھوکے ہیں، بیمار ہیں، بے روزگار ہیں۔ ہمارا مسئلہ نہ شراب ہے نہ اسلامی آئین۔ ہمیں روزگار چاہیئے، بیماروں کو علاج چاہیئے، بچوں کو سستی تعلیم چاہیئے مگر نیپ اس فکر میں ہے کہ کراچی کے سرمایہ داروں سے سرحد میں سرمایہ لگوا کر ان کی محنت

نیپ کا کنونشن لیگی جاگیرداروں کے ساتھ گٹھ جوڑ

کا استحصال کرایا جائے۔ سرحد کے جاگیردار اور خوانین کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔ ایوب کھوڑو اور ایسے ہی دوسرے کنونشن لیگی وڈیروں کو نیپ میں شامل کیا جائے۔ تاکہ نیپ کے لیبل میں ایک بار پھر ایوب خان کی کنونشن لیگی طرز کی حکمرانی قائم ہو جائے۔

چنانچہ نیپ میں دھڑے بندیاں ہو رہی ہیں۔ محمود الحق عثمانی اردو اور مہاجرین کے نام پر اپنی سیاست چمکا رہے ہیں۔ ولی خاں ان کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ نیپ کا جو دھڑا خود کو سوشلسٹ کہتا ہے وہ سندھی کے نام پر سندھی شاونزم کو ہوا دے رہا ہے۔ کوئی دھڑا جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے بل بوتے پر اپنے اقتدار کو وسیع تر بنانا چاہتا ہے۔ کوئی اس کے لئے روس اور بھارت کے سہارے منزل پر پہنچنا چاہتا ہے۔

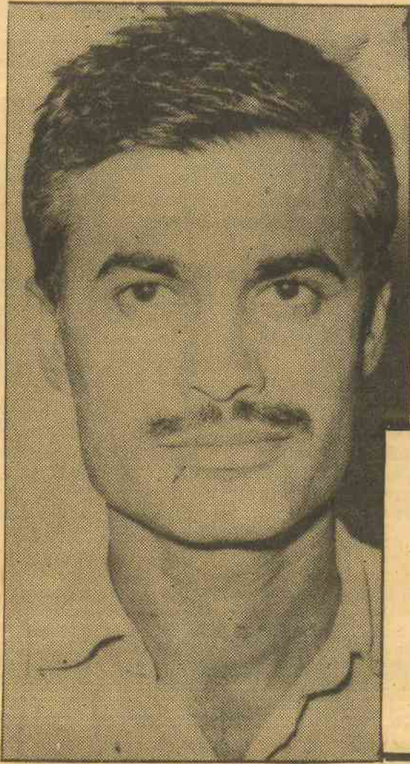
پیپلز پارٹی جو مغربی پاکستان کی سب سے بڑی جماعت تھی اور جس نے ایوب آمریت کے خلاف ابھرنے والی عوامی قوت کے بل پر انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ عوام سے طرح طرح کے وعدے کئے۔ مگر اقتدار سنبھالنے کے بعد وڈیرہ سیاست کا شکار ہو گئی۔ سرمایہ داروں کو اس نے دبانے کی کوشش کی مگر جب سرمایہ داروں نے اپنے سازشی حربے اختیار کئے تو حکمران سے مصالحت کر لی حتیٰ کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے محنت کشوں کے پروگراموں پر پابندی عاید کر دی گئی کہ اس سے طبقاتی منافرت پھیلتی ہے۔ اب جو کچھ محنت کشوں کے نام پر پروگرام ہوتے ہیں۔ اس میں مزدور کی بجائے آخری تجزیئے میں سرمایہ داری کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

زرعی اصلاحات کے ذریعے کسانوں اور ہاریوں کی ابھرتی ہوئی تحریک کو گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس زرعی اصلاحات سے کسانوں کو تو کچھ نہ ملا۔ البتہ وڈیروں اور جاگیرداروں کے ہاتھ اور مضبوط ہو گئے۔ اقتدار مملکت پر ان ہی کا قبضہ رہا۔ مزارعوں کی بیدخلیوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ کسان اسی طرح غربت و افلاس میں مبتلا ہیں اور جاگیرداری نظام کے استحصال کے شکار ہیں۔ احتجاج کرتے ہیں تو پولیس فوراً حرکت میں آجاتی ہیں۔ گرفتاریاں ہوتی ہیں اور گولی چلتی ہے۔ رسہ گیری اور اغوا کی وارداتیں کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئی ہیں۔

حکومت کا حال یہ ہے کہ صوبوں میں ایم پی اے کے بجائے ایم۔ این۔ اے وزیر اعلیٰ ہیں۔ گورنر ہیں، وزیر ہیں۔ منتخب نمائندوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ باہر کے لوگوں کو اقتدار میں شامل کیا جاتا ہے سندھ اس کی بہت واضح مثال ہے۔ عبدالوحید کٹپر کو صوبائی اسمبلی کا ممبر نہ ہونے کے باوجود صرف وزیر اعلیٰ ممتاز بھٹو کا قریبی رشتہ دار ہونے کے باعث وزیر بنا دیا جاتا ہے۔ پہلے جہاں آبادی کو نظر انداز کیا جاتا ہے جب اس پالیسی پر نظر ثانی ہوتی ہے تو سعید حسن اور عبدالوحید عرشی کی بجائے کمال اظفر کو صوبائی کابینہ میں لیا جاتا ہے حالانکہ کمال اظفر انتخابات میں ناکام ہوئے اور سعید حسن اور عرشی صوبائی اسمبلی کے منتخب ارکان ہیں۔

ان غیر جمہوری اور نامناسب اقدامات کا نتیجہ یہ برآمد ہو رہا ہے کہ پیپلز پارٹی کی اسمبلی پارٹیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ایک صوبائی رکن دوسرے کے خلاف بیان دیتا ہے۔ اس میں اتحاد اور یک جہتی کے بجائے اختلاف اور تعصبات جنم لے رہے ہیں اور اس کا اثر بحیثیت

باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ فرمائیں



ظالم ایک طرف ـــــ مظلوم ایک طرف

متحدہ مزدور فیڈریشن سندھ کے صدر

عثمان بلوچ سے ایک ملاقات

مزدوروں کے سروں اور سینوں کو نشانہ بنایا گیا

کراچی کے باشعور اور جیالے مزدوروں نے ۱۹ جون سے ہڑتال ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ فیصلہ اُسی جگہ نشتر پارک میں کیا گیا۔ جہاں ۳ جنوری ۱۹۷۲ء کو صدر بھٹو نے جلسہ عام سے شیخ مجیب الرحمان کی رہائی کے بارے میں منظوری لی تھی اور مزدوروں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا کہ

"میں سب سے مقابلہ کرسکتا ہوں مگر آپ سے مقابلہ نہیں کرسکتا ......"

لیکن حالات اور واقعات نے ثابت کردیا کہ پیپلز پارٹی نے اغیار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے، اُس سے پنجہ آزمائی کرنے کی بجائے سب سے پہلے مزدور طبقہ سے مقابلہ کیا۔ ریاستی بندوقوں نے سب سے پہلے محنت کشوں پر تشدد کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے صرف دو دنوں میں مبینہ طور پر متعدد محنت کش خاندانوں کے چراغ گل کردیئے۔ ہڑتال ختم ہونے سے بظاہر فضا کی گھٹن ختم ہوگئی ہے۔ حالات پُرسکون معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر مزدوروں کی بے چینی دور نہ کی گئی۔ اپنے وقار کا مسئلہ بناکر صوبائی حکومت اور ارباب اقتدار نے حقائق سے چشم پوشی کی تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ اور وہ لاوا جو اندر ہی اندر پک رہا ہے پھر پھوٹ نکلے گا۔

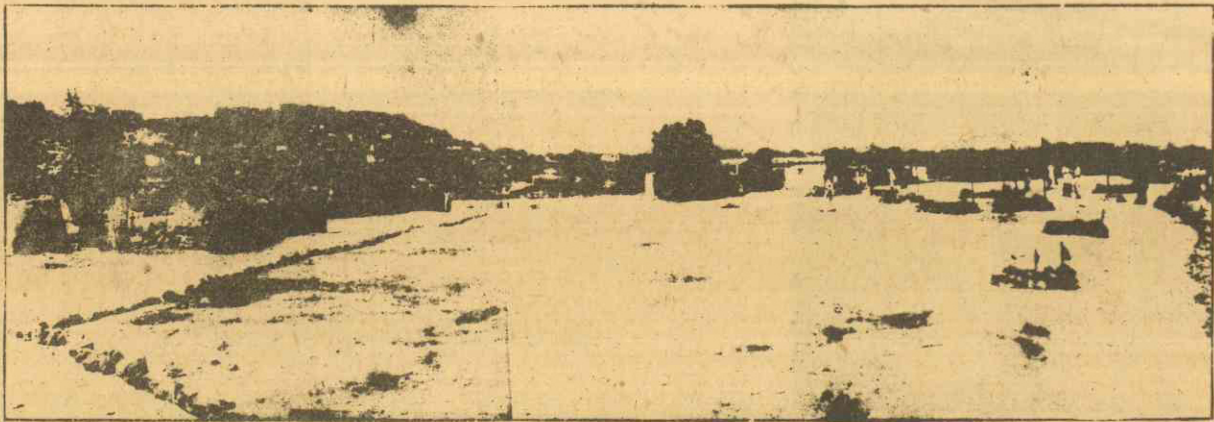
وہاب صدیقی

۷ جون کی مزدور تحریک میں مزدوروں اور مزدور تنظیموں نے اتحاد کا اعلیٰ مظاہرہ کیا۔ آٹھ مزدور تنظیموں، متحدہ مزدور فیڈریشن سندھ، پاکستان ورکرز فیڈریشن، مزدور رابطہ کونسل، ویسٹ پاکستان ٹریڈ یونینز فیڈریشن، پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز، پاکستان ٹیکسٹائل لیبر یونین، سندھ فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز، لیبر آرگنائزنگ کمیٹی لانڈھی نے گروہی سیاست کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف متحدہ محاذ بنایا۔ کیونکہ مزدور رہنما جانتے تھے کہ یہ کسی ایک مزدور تنظیم کا مسئلہ نہیں، ایک مزدور رہنما کا مسئلہ نہیں، بلکہ تمام مزدوروں کا مسئلہ ہے۔ اگر اس موقع پر انہوں نے اتحاد نہ کیا تو ان کا مشترکہ دشمن ایک ایک کرکے سب کو ختم کردے گا۔ صوبائی حکومت اور کراچی کی انتظامیہ نے مزدوروں کے اس متحدہ محاذ کو توڑنے کے لئے مکروہ حربے استعمال کئے، سازشیں کیں۔ لیکن محنت کشوں نے اپنے شعور کا اعلیٰ مظاہرہ کرتے ہوئے ان سازشوں کو ناکام بنادیا۔ لیکن اس تحریک میں جس مزدور رہنما کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ وہ متحدہ مزدور فیڈریشن سندھ کے صدر جناب عثمان بلوچ تھے۔

جناب عثمان بلوچ نے ایک ملاقات کے دوران نئی لیبر پالیسی کو ۷ اور ۸ جون کے المناک واقعات کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ "اس پالیسی کا مقصد وہی ہے جو نور خان کی لیبر پالیسی کا تھا۔ یعنی سرمایہ کار ارتکاز ہو۔ سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان اختلاف رہے۔ صرف الفاظ کا فرق ہے۔ نئے خواب دکھائے گئے ہیں۔ اور حسین وعدوں کے جال بچھائے گئے ہیں۔" انہوں نے بتایا کہ نئی لیبر پالیسی کے اعلان سے قبل مرکزی وزیر محنت نے کراچی میں مزدور رہنماؤں سے ملاقات کی اور لیبر پالیسی پر تبادلہ خیال کیا۔ مزدور رہنماؤں کی طرف سے پیش کردہ نکات اور تجاویز انہوں نے نوٹ کیں۔ لیکن جب نئی لیبر پالیسی کا اعلان کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مزدور نمائندوں کی تجاویز کو بالکل نظرانداز کردیا گیا۔ لیبر پالیسی مزدوروں کی توقعات کے بالکل منافی تھی۔ اس لیبر پالیسی میں صنعتی تنازعات کو "قابل دست اندازیٔ پولیس" قرار دے کر مزدوروں کو گرفتار کرنے کی اجازت دی گئی۔ سرمایہ دار کا بھی چالان ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ صرف کاغذی بات ہے۔ مزدوروں کو گمراہ کرنے اور خوش کرنے کا ایک نیا جال ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس استحصالی اور سرمایہ دارانہ نظام میں جو ایک سرمایہ دار کو راتوں رات لاکھوں روپیہ کمانے کی اجازت تو دیتا ہو، لیکن ایک محنت کش کو جو اپنے جائز اور قانونی حق مانگنے پر "ملک دشمن" قرار دیتا ہو۔ سرمایہ دار کبھی گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔ اور چند ماہ میں ہی حالات نے اس حقیقت کو ثابت کردیا۔ مزدوروں کو گرفتار کیا گیا۔ سرمایہ داروں کو مراعات دی گئیں۔ ظلم و ستم کی اجازت اور کھلی چھوٹ دی گئی۔

جناب عثمان بلوچ نے کہا کہ نئی لیبر پالیسی نے مزدوروں کی وہ تمام خوش فہمیاں دور کردی ہیں۔ جو وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے "سوشلزم ہماری معیشت ہے" کے نعرے سے وابستہ کر بیٹھے تھے۔ دراصل پیپلز پارٹی کا "اسلامی سوشلزم" "جاگیردارانہ سوشلزم" ہے جس کے بارے میں کارل مارکس نے لکھا ہے۔

"جاگیردار طبقہ کو اپنے لئے ہمدردی اور حمایت اُسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب وہ بظاہر یہ بھول جائے کہ سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد میں خود اس کا اپنا مفاد شامل ہے اور سرمایہ داری کی



شہید چوک۔ کراچی کے مزدور اپنے شہید ساتھیوں کی یاد میں یادگار تعمیر کرینگے

اسلامی سوشلزم، جاگیردارانہ سوشلزم ہے

مخالفت اس طرح کرے گویا اس سے صرف مظلوم مزدور طبقے کا ہی بھلا مقصود ہے..... جب سیاسی عمل کا وقت آتا ہے تو یہ (جاگیردار) مزدور طبقے کو کچلنے میں ہاتھ بٹاتے ہیں اور عام زندگی میں اپنے اعلیٰ انظریاتی نعروں کے باوجود، صنعت کے درخت سے گرے ہوئے پھلوں کو بٹورنے کے لئے اوندھے مُنہ پل پڑتے ہیں۔"

جناب عثمان بلوچ نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اپنے مزدور دشمن عزائم اور "جاگیردارانہ سوشلزم" کے مقاصد کو چھپانے کے لئے پاکستان پیپلز پارٹی نے "اسلامی سوشلزم" کا نعرہ لگایا۔ اس سلسلے میں کارل مارکس کے یہ الفاظ بتانے ہی کافی ہوں گے۔

"جس طرح پیر ہمیشہ زمیندار کا ہمرکاب رہا ہے، اُسی طرح جاگیردارانہ سوشلزم کے ساتھ مذہبی سوشلزم بھی رہا ہے....."

جناب عثمان بلوچ نے بتایا کہ لیبر پالیسی کا اعلان کرتے ہی حکومت اور سرمایہ داروں نے مزدور دشمن منصوبوں پر عمل شروع کر دیا، ملوں، کارخانوں سے مزدوروں کو برطرف کیا جانے لگا۔ تالہ بندیاں شروع ہوگئیں۔ بعض ملوں میں شفٹ کم کردی گئیں۔ زیب تن ٹیکسٹائل ملز، غفور ٹیکسٹائل ملز، خورشید ٹیکسٹائل ملز، نشیل اسپننگ، ایچ۔ ایم سلک ملز، لاکھانی ٹیکسٹائل ملز، الحبیب، ایلایٹ، شالیمار، وغیرہ میں تالہ بندی کردی گئی یا شفٹ میں کمی کر دی گئی۔ دوسری جانب سرمایہ داروں، نوکر شاہی اور حکومت نے گٹھ جوڑ کرکے مزدوروں کے خلاف نفرت کی مہم شروع کردی، ان پر جلاؤ، گھیراؤ کا بے بنیاد الزام لگایا جانے لگا۔ سرمایہ داروں کے اخبارات اور ریڈیو نے اس پروپگنڈہ کو خوب ہوا دی۔ بیانات کی بھرمار ہونے لگی کہ "گھیراؤ، جلاؤ بند کرو ـــــ صنعتی پیداوار بڑھاؤ"۔ ریڈیو نے تو حد کردی، عاشورہ کے دن ایک مولوی کی تقریر نشر کی جس میں انہوں نے گھیراؤ اور جلاؤ کرنے والوں کو "یزید" کے ساتھی قرار دیا۔ حالانکہ حکومت سرمایہ دار، نوکر شاہی، اخبارات اور ریڈیو جلاؤ کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں کرسکتے۔ اس پروپگنڈہ کا مقصد صرف مزدوروں کو بدنام کرنا، اور اُن کے اور عوام کے درمیان نفرت پیدا کرنا تھا۔

انہوں نے بتایا کہ متحدہ مزدور فیڈریشن سندھ، پاکستان ورکرز فیڈریشن، مزدور رابطہ کونسل، سندھ فیڈریشن آف ٹریڈ یونین پاکستان ٹیکسٹائل ملز لیبر یونین، پاکستان ٹریڈ یونینز فیڈریشن کی جانب سے ۱۲ جون کو لیبر پالیسی پر ایک مذاکرہ ہونے والا تھا۔ تاکہ نئی لیبر پالیسی کے نقائص کی نشان دہی کرکے اُسے تبدیل کرانے کی پُرامن جدوجہد کی جائے اور اس مذاکرے کے انتظامات کو آخری شکل دینے کے لئے ان فیڈریشنوں کا اجلاس ۱۰ جون کو ہونے والا تھا۔ لیکن حکومت، سرمایہ داروں اور نوکر شاہی نے اس پُرامن جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کے لئے ۷ جون کو فیروز سلطان انڈسٹریز کے نہتے مزدوروں پر حکومتی بندوقوں کے دھانے کھول دیئے گئے۔

جناب عثمان بلوچ نے ۷ اور ۸ جون کے المناک واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ۷ جون فیروز سلطان انڈسٹریز کے محنت کشوں کی تنخواہ کی ادائیگی کا دن تھا۔ تنخواہ کے علاوہ منافع کا ۲½ فی صد حصہ ملنے والا تھا۔ جب تین بجے مزدور تنخواہ لینے ملز کے دفتر پہنچے تو ملز مالکان نے تنخواہ دینے سے

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں

اب یوم حسن ناصر
شہید چوک پر منایا جائیگا

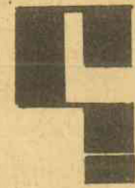


اس سال یوم حسن ناصر شہید، شہید چوک بنارس کالونی پر منایا جائیگا۔ تاریخ آگے کی طرف بڑھ رہی ہے نفیو سوفیکل، کنٹرک اور دوسری بلند عمارات سے نکل کر اب ہم اپنے قائد کا یوم شہادت اُس جگہ پر منائیں گے جسے کراچی کے مزدوروں نے اپنے خون سے سینچا ہے۔

ـــــ عثمان بلوچ



پاک بھارت مذاکرات کیوں، کیسے اور کس طرح





آج کے بنگلہ دیش کو نہیں۔ کل کے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا جائے

سہراب اسلم ایڈووکیٹ

جون ۱۹۷۲ء کے اختتام کے قریب پاک بھارت سربراہوں کی کانفرنس میں پاکستان کا رویہ کیا ہونا چاہیئے۔ یہ وہ سوال ہے جو جناب ذوالفقار علی بھٹو نے عوام سے کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی قومی اور بین الاقوامی اہمیت کے مسائل پر عوام سے براہِ راست رجوع کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ اس کے بہت سے فوائد ہوں گے۔ حکومت کی پالیسیاں چند "اعلیٰ دماغ" اور عوام سے الگ تھلگ مشیروں کے زرخیز ذہن کی بجائے عوام کے احتجاجی شعور کی راہ نمائی میں وضع ہوں گی اور ان کی بنیاد اِن حقائق پر ہو گی۔ جن کی جڑیں پاکستان کی دھرتی اور عوام کے ذہنوں میں ہوں گی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر سیٹو سنٹو جیسے سامراجی معاہدوں کی منسوخی اور جاگیرداری، سرمایہ داری کے خاتمہ کیلئے بھی یہی انداز اختیار کیا جائے جو پاک ہند مذاکرات کے لئے کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا سوال کا جواب دینے کے لئے ہم مندرجہ ذیل عنوان قائم کرتے ہیں۔

کیا بنگلہ دیش کی تحریک قومی آزادی کی تحریک تھی

جی نہیں! بنگلہ دیش کی تحریک ابتداً صوبائی خودمختاری اور بین الصوبائی استحصال کے خاتمے کی تحریک تھی۔ ۱۹۶۲ء کے بعد چین اور پاکستان ایک دوسرے کے قریب ہونے لگے۔ نیفا میں ہندوستانی فوج کی پٹائی نے ہندوستان کی فوجی طاقت کا پول کھول دیا اور اُدھر مغربی پاکستان میں غیر شعوری طور پر ہمارے فوجی حکمرانوں کے ذہن میں "سیاسی جوا"، جنگ کی صورت میں کھیلنے کی خواہش بیدار ہونے لگی۔ ایوب خاں اور اس کے فوجی مشیروں نے اپنے طور پر سوچا کہ اگر "کشمیر" کے مسئلے کو فوجی حکومت "حل" کر دینے میں کامیاب ہو جائے تو فوجی آمریت کو دوام بخشنے کی راہیں ہموار ہو جائیں گی۔ کیونکہ کشمیر کے مسئلہ پر عوام کا ردِ عمل خاصا جذباتی تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے لیکن کشمیر کا مسئلہ بنیادی طور پر مغربی پاکستان کا مسئلہ تھا۔ یعنی مشرقی پاکستان کا ردِ عمل کشمیر کے بارے میں اتنا شدید نہیں تھا۔ جتنا کہ مغربی پاکستان اور بالخصوص پنجاب میں (یہ وہ حقیقت ہے جسے اب تسلیم کر ہی لینا چاہیئے کیونکہ اسے تسلیم نہ کر کے ماضی میں بہت غلطیاں کی گئی ہیں) ۱۹۶۵ء کی جنگ میں حکمرانوں نے یہ چالاکی دکھائی کہ بڑی جنگ یعنی Main Confrontation کو مغربی پاکستان کی سرحدوں تک محدود رکھا اور مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر صرف اپنے دفاع پر اکتفا کیا۔ اس طرح مشرقی پاکستان کے عوام کے اس تاثر کو گہرا کر دیا کہ کشمیر کا مسئلہ اصل میں مغربی پاکستان کا مسئلہ ہے اور مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے حکمرانوں نے خواہ مخواہ جنگ میں الجھا دیا ہے۔

۱۹۶۶ء میں ہندوستانی حکمرانوں کی یہ حکمتِ عملی کامیاب ثابت ہوئی اور جنگ ۱۹۶۵ء کے فوراً بعد ۱۹۶۶ء میں مجیب الرحمان چھ نکات لے کر لاہور پہنچ گئے۔ مجیب نے COP میں چھ نکات کی بنیاد پر اتحاد کی بات کی مگر فریقین میں مفاہمت کا راستہ ہموار نہ ہو سکا، اور مجیب الرحمان مغربی پاکستان سے پہلا واک آؤٹ کر گئے —— یہ اس بات کی علامت تھی کہ دائیں بازو کے سیاستدان (مغربی پاکستانی مشرقی پاکستان کے دائیں بازو کے اصل نمائندے مجیب الرحمن دو واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ محض سوشلزم کا نام لینے سے کوئی دائیں بازو کا نمائندہ بائیں بازو کا نمائندہ نہیں ہو سکتا) سے مل کر نہیں چل سکتے۔ نکتہ اختلاف صرف یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے دائیں بازو کے سیاستدان عوام کی لوٹ کو صرف مغربی پاکستان کے لوٹنے والے طبقے کا "حق" سمجھتے تھے جب کہ مجیب الرحمان اس لوٹ کھسوٹ میں سے اپنے بنگالی سرمایہ داروں کا حصہ طلب کر رہے تھے ——: گویا مجیب کا پہلا واک آؤٹ لوٹ کھسوٹ کی تقسیم پر ہوا۔ اور یہی نکتہ آغاز نکتۂ انجام ثابت ہوا۔ طوالت کے پیش نظر مزید بحث ممکن نہیں۔

مندرجہ بالا تجزیے کی روشنی میں اور خاص طور پر جب کہ بنگالی زبان کو برسوں پہلے قومی زبان تسلیم کیا جا چکا تھا بنگلہ دیش کی تحریک کو قومی آزادی کی تحریک نہیں کہا جا سکتا کیونکہ مجیب الرحمن خود اپنی تقریروں میں یہ کہہ چکے تھے کہ وہ علیحدگی یا آزادی بلکہ صوبائی خودمختاری مانگ رہے ہیں یعنی اگر چھ نکات کو مان لیا جاتا تو آج ملک کے وزیر اعظم مجیب ہوتے اور لوٹ کھسوٹ کا وہ بازار جو سہگلوں داؤدوں، ہارونوں، دولتانوں، ٹوانوں، لغاریوں نے گرم کئے رکھا۔ اب مشرقی پاکستان کے بنگالی سرمایہ دار، جاگیردار (جوت دار) کرتے۔ سوال عوام کو لوٹ کھسوٹ سے نجات دلانے کا نہیں تھا۔ ان کی لوٹ کو بانٹنے یا کنٹرول کرنے کا تھا۔ واقعات نے عملی طور پر اس کی تائید کر دی ہے۔

بنگلہ دیش یا بین الاقوامی سامراجی سازش

چھ نکات امریکہ کی دین تھے۔ مجیب کو امریکہ نے اپنے مخصوص مفاد کی خاطر چنا تھا۔ امریکہ نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جو کردار ادا کیا وہ یہ تھا کہ رن آف کچھ (رن کچھ) کے تصادم کے بعد امریکی

بنگلہ دیش سامراجی ملکوں کی پیداوار ہے

حکومت نے پاکستان کو یقین دلایا کہ اگر پاک بھارت جنگ ہوئی تو وہ بین الاقوامی سرحد پر نہیں ہونے دی جائے گی۔ یعنی پاکستان کو اس امریکی گارنٹی دی کہ جنگ کی صورت میں بھارت کو کشمیر کے علاوہ اور کہیں فوجی کارروائی کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو امریکہ مداخلت کرے گا۔ لیکن ۶ ستمبر کو رات کی تاریکی میں بھارتی فوج نے لاہور سرحد کو عبور کر کے پاکستان کے خاصے علاقہ پر قبضہ جما لیا اور مزید علاقے ہتھیانے کے لئے شدید حملے کرنے لگی۔ جنگ پاکستان کی تمام سرحدوں پر پھیل گئی۔ مگر امریکہ ٹس سے مس نہ ہوا اس کے برعکس چین نے پاکستان کی کھل کر حمایت کی۔ حتیٰ کہ تیسری عالمگیر جنگ کا خطرہ مول لے کر پاکستان کو بچایا۔ اس کا فطری ردعمل یہ ہوا کہ عام پاکستانی چین کو اپنا واحد قابلِ اعتماد دوست سمجھنے لگا۔ یہ ردِ عمل مغربی پاکستان میں خاصا شدید تھا کیونکہ ۱۹۶۵ء کی جنگ بنیادی طور پر مغربی پاکستان کی سرحدوں پر لڑی گئی تھی۔ ان حالات میں امریکی سامراج نے ویت نام سے نکلنے کی صورت میں متبادل مورچہ کے لئے مشرقی پاکستان کو منتخب کیا اور اس مقصد کے لئے مجیب الرحمان کی سیاست دراصل امریکہ اور امریکہ کی سیاست مجیب کی سیاست بن گئی۔ ادھر جون، ۱۹۶۷ء میں مشرقِ وسطیٰ میں عرب اسرائیل جنگ ہوئی اور جنگ بندی کے باوجود عربوں نے اسرائیلی امریکی سامراج کے خلاف گوریلا طریقہ جنگ جاری کیا۔ جارج حبش اور یاسر عرفات نے اسرائیلیوں کا ناک میں دم کر دیا۔ امریکی یہودی اپنی حکومت سے مطالبہ کرنے لگے کہ ویت نام کی جنگ کی بجائے اسرائیل عرب جنگ کو اولیت دی جائے کیونکہ ایک طرف تو عرب کے تیل کا مسئلہ تھا اور دوسری طرف یہودی ریاست اسرائیل کا تحفظ، ویت نام کی جنگ کے خلاف مظاہرے پہلے بھی ہوتے تھے۔ مگر شدت اسی دور میں آئی۔ امریکہ نے پیرس امن مذاکرات کو قبول کیا اور یوں ایشیا سے امریکی سامراج کے اخراج کی پہلی قسط پر بات چیت شروع ہوئی۔ امریکہ ایشیا سے نکل رہا ہے؟ روسیوں کے ذہن نے اس سوال پر غور کیا اور ایک فیصلہ پر پہنچ گئے۔ وہ فیصلہ تھا۔ مشرقی پاکستان کو سوشل سامراج کے حملے کا نشانہ بنانا! یہ صرف ہندوستان کی مدد سے ممکن تھا۔ ہند روس فوجی معاہدہ ہوا اور پھر وہ سب کچھ ہوا جسے آج "بنگلہ دیش" کہا جا رہا ہے۔ وہ بنگال کو پہلے مغربی پاکستان کا سرمایہ دار لوٹ رہا تھا اب اس کو لوٹنے والوں کی تعداد درجنوں تک پہنچ گئی ہے —— یہ ہے آج کا "بنگلہ دیش"! (یہ الفاظ ہمارے نہیں محمد طحہٰ کے ہیں) اسے تسلیم کرنا سامراج دوستی کہلائے گا۔ نیز برصغیر میں پائیدار امن کے قیام میں بھی رکاوٹ پیدا ہوگی۔ ہندوستانی توسیع پسند دیگر پڑوسی ممالک اور بچے کھچے پاکستان کو ہڑپ کرنے کے خیال سے خالی نہیں ہیں۔ مشرقی پاکستان میں کامیاب فوجی مداخلت نے ہندوستانی سامراجیوں کے حوصلے بلند کر دیئے ہیں۔ وہ چاہیں گے اسی تجربہ کو موقع ملنے پر پھر دہرایا جائے۔

بیرونی مداخلت سے حاصل کردہ "دیش" نہ بنگلہ ہے اور نہ دیش۔ آزادی کا پودا آزادی پسند دھرتی کے عوام کے ذہنوں اور بازوؤں کی طاقت سے تناور درخت بنتا ہے۔ سامراجی سازشوں اور بیرونی مداخلت سے حاصل کردہ ممالک کا انجام وہی ہے جو جنوبی ویت نام، جنوبی کوریا، فارموسا اسرائیل کا ہے۔

"اگر تسلیم کرنا ہی ہے تو آج کے بنگلہ دیش کو نہیں کل کے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا چاہئیے۔"

مجیب کا بنگلہ دیش امریکی روسی برطانوی سامراج کی سازش سے حاصل کردہ بھارتی طفیلی ملک کا نام ہے۔ موجودہ بنگلہ دیش دنیا بھر کے سامراج کی ناجائز اولاد ہے۔ یہ سیاسی طوائف الملوکی اور گماشتہ سرمایہ دار کی گھناؤنی سازشوں کا نتیجہ ہے۔ ہمارا دور یقیناً قومی آزادی کی تحریکوں کا دور ہے۔ مظلوم قومیتوں کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ سامراجیوں کے خلاف جنگ لڑیں۔ یہ راستہ مزدوروں، کسانوں کی قیادت میں سامراج دشمن تحریک کا راستہ ہے۔ کوئی سامراجی ایجنٹ یا نام نہاد قومی سرمایہ دار اس کی قیادت کی اہلیت نہیں رکھتا۔ قومی آزادی کی جنگ قومی حق خود اختیاری لئے ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ حق آج کی دنیا میں مسلح جدوجہد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ بندوق کی نالی کا راستہ ہے۔ مجیب جیسے الیکشن باز اس کی قیادت کے اہل نہیں دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے خاتمہ کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان دنیا بھر کے سامراج اور بالخصوص ہندوستانی سامراج کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ اس دیش میں آزادی کی اصل جنگ اب شروع ہوتی ہے یہ ہے سامراج دشمنی اور آزادی کی راہ، اس پر چلنے کے لئے مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کے کسانوں کی تحریک (نکسل باڑی) نے متحدہ طور پر کوشش کا آغاز کیا ہے۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ بنگال کے انقلابی کسان، سامراج سرمایہ داری اور جاگیرداری سے نجات کی یہ جنگ مل کر لڑیں گے۔ اگر بنگالی قومیت نے زندہ رہنا ہے تو مغربی بنگال کو بنگلہ دیش (کل کا بنگلہ دیش) کی تحریک میں مدد دینا ہوگی۔ چارو موجمدار اور محمد طحہٰ کا راستہ ایک ہے۔ اور وہ ہے امریکی بھارتی روسی سامراج سے آزادی —— مسلح جدوجہد اور انقلاب!

اگر تسلیم ہی کرنا ہے تو ہمیں ہندوستان کے فوجی حملہ کو جائز قرار دینے کی بجائے آئندہ بننے والے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ہے کیونکہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔

پاکستانی فوجوں کی واپسی

بعض شکست خوردہ ذہن بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لئے بھارت میں مقید پاکستانی فوجوں کی واپسی کو جواز بنا رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستانی فوجوں کی واپسی کے لئے واحد راستہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ بین الاقوامی طور پر بھارتی حکومت کے لئے ممکن نہیں کہ جنگ بندی کے نتیجے میں ہتھیار ڈالنے والی فوج کو غیر معینہ مدت کے لئے قید رکھ سکے۔ یہ بات خود ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہے۔ جب تک پاکستانی فوجیں ہندوستان کی قید میں رہیں گی موجودہ "بنگلہ دیش" کی آئینی حیثیت متنازعہ رہے گی جب کہ ہندوستانی سامراج یہ چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ طے پا جائے۔ یہ جلد بازی اس بچوکی سی ہے جو نکل بھاگنے کی جلدی میں جوتے کا صرف ایک پاؤں اٹھا کر بھاگ نکلا تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ قومیتوں کے مسئلہ پر ہندوستان کی حکومت میزو، ناگا، تامل، ناڈو، مدراسی، سکھ قوم پرستوں کا سامنا ہے۔ بھارتی حکمران نہیں چاہتے کہ یہ قومیں بنگلہ دیش کی راہ اختیار کریں (علیحدگی کی صورت میں) وہاں مظلوم قومیتیں پاکستان کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ ان کی جنگ آزادی کو دبانے کے لئے بھارتی سامراج کے لئے ضروری ہے کہ وہ بنگلہ دیش کا مسئلہ جلد از جلد "طے" کرے۔

بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کیلئے

امریکی روسی دباؤ

امریکہ یہ کوشش کر رہا ہے کہ پاکستان کی موجودہ حکومت کو بنگلہ دیش تسلیم کرنے پر رضامند کر لیا جائے تاکہ سامراجی سرمایہ محفوظ رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ماسکو چاہتا ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے مغربی پاکستان روسی قرضوں کے حصول کے لئے متوجہ ہو تاکہ مغربی پاکستان میں موجود امریکی سرمایہ کے مقابلے میں روسی سرمایہ بھی مقابلہ میں آئے اور بچے کھچے پاکستان کی سامراجی لوٹ میں امریکہ کے ساتھ روس بھی ساجھے دار بن جائے۔ ان حالات میں موجودہ حکومت کے امتحان کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ بھٹو صاحب نے اپنی "تحریک" کا آغاز سامراج دشمن نعروں سے کیا تھا۔ اقتدار میں آنے کے بعد سے جواب تک اقدامات ان کی حکومت نے کئے ہیں انہیں ہرگز سامراج دشمن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً۔

(۱) سامراجی قرضوں کی واپسی کا وعدہ۔

(۲) سیٹو سنٹو سے وابستگی۔

(۳) کوسیگن کی دھمکی۔ "اگر دوبارہ وہی صورت حال پیدا ہوئی تو روس وہی کردار ادا کرے گا جو اس نے بنگلہ دیش کے بارے میں ادا کیا۔" پر بھٹو صاحب کی خاموشی —— اگر موجودہ روش جاری رہی تو محب وطن پاکستانیوں کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ سامراج اور سوشل سامراج سے جنگ آزادی کے لئے تحریک کا آغاز کریں۔ اس صورت میں موجودہ حکومت کو یہ گلہ نہیں ہونا چاہئیے کہ انہیں صحیح راستہ دکھائی نہ دے سکا۔



پارٹی کے اندرونی
اختلافات کے بارے میں
اسٹالن کی رپورٹ

نظریاتی اختلافات میں مفاہمت نہیں ہوسکتی

۱۹۲۶ء میں روس (بالشویک) پارٹی کی کمیٹی میں اسٹالن نے ایک جامع رپورٹ پیش کی تھی۔ یہ رپورٹ موجودہ روسی کیمونسٹ پارٹی اور مظلوم اقوام عالم کی ترقی پسند جماعتوں کے اندرونی نظریاتی جدوجہد میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ چنانچہ اس کا مکمل ترجمہ مندرجہ ذیل میں درج کیاجاتاہے۔ (ادارہ)

ہماری پارٹی کے اتحاد کے لئے جن باتوں پر سب سے پہلے بحث کی جارہی ہے۔ وہ پارٹی کے اندرونی اختلاف کے خلاف ضرب کاری ہے۔ یہ جدوجہد کافی عرصہ سے جاری ہے اور ابھی اختتام کو نہیں پہنچی۔ پارٹی کی بنیاد ہی سے اس جدوجہد کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ پارٹی کے اتحاد کے لئے ۱۹۰۰ء سے اب تک جتنی بھی پالیسیاں مرتب کی گئیں وہ سب کی سب اس خاص مسئلہ کی طرف نشان دہی کرتی ہیں اور یہ ظاہر کرتی ہیں کہ پارٹی کی ہر پالیسی کا پس منظر پارٹی کے اندرونی اختلافات کی تاریخ ہے۔ اندرونی اختلافات کی تاریخ اور ان مسائل کی پیچیدگیوں اور اس پر سیر حاصل بحث میں ہی ہمارے پارٹی کے مضبوط تر ہونے کا راز مضمر ہے۔ ان باتوں سے ایک اندازہ قائم کیاجاسکتا ہے کہ روس کے لوگ بڑے جھگڑالو اور تند و تیز مزاج ہوتے ہیں۔ اور نظریاتی اختلافات کو بڑھاتے ہی جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پارٹی کی بتدریج ترقی، اندرونی اختلافات اور اس کے وقتاً فوقتاً تدارک کے درمیان ہوئی۔ مگر دوستو اس طرح کا نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہے۔ دراصل مسئلہ کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اندرونی اختلافات نظریاتی اختلافات کی وجہ سے ہی ہوتے ہیں۔ پارٹی جتنی زیادہ طبقاتی جدوجہد پر متحد اور منظم ہونے لگی۔ نظریاتی اختلافات اتنا ہی زیادہ ابھر کر سامنے آنے لگے۔ سچی بات یہ ہے کہ اندرونی اختلافات کا تدارک صرف واضح نظریاتی شعور، جدوجہد، صحیح نصب العین، متحد و منظم طریقہ کار اور مسلسل جدوجہد کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ پارٹی کے اندرونی اختلافات کے پیش نظر آج کی پالیسی کیا ہونی چاہیئے "

اس قسم کے اہم مسائل پر اتفاق ہوسکتا ہے اور ایسا کرنا ضروری بھی ہے۔ مگر اس معاملہ میں خوب احتیاط برتنی چاہیئے کہ اگر اختلافات نظریاتی ہوں تو پھر کسی قسم کی مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا افہام و تفہیم سے اس قسم کے مسائل کا کوئی حل نہیں ہوسکتا۔ نظریاتی اختلافات کے تدارک میں کوئی درمیانی راستہ نہیں ہے اور ایسا ناممکن ہے۔ اصول جیسا بھی ہو اور جس پارٹی سے بھی متعلق ہو وہی اس پارٹی کی مکمل نظریاتی بنیاد ہے۔ درمیانی راستہ یا سودا بازی عوام کے شعور کو مفلوج کرتا ہے اور ان کے ذہنوں میں

درمیانی راستہ یا سودے بازی عوام کے شعور کو مفلوج کر دیتی ہے

مختلف قسم کے شکوک وشبہات پیدا کرتا ہے۔ اختلافات کو اور زیادہ تقویت بخشتا ہے اور پارٹی کو غلط راستہ پر ڈال دیتا ہے۔ اس قسم کی غلطی پارٹی کے نظریات اور نصب العین کے لئے موت ہے۔

آج کی مغربی سوشل جمہوری پارٹیاں کیسے اب تک زندہ ہیں اور ترقی کر رہی ہیں؟ ان پارٹیوں میں کیا کوئی اندرونی تضاد نہیں ہے؟ ان لوگوں میں کیا کوئی اصولی اختلافات نہیں ہیں۔؟ یقیناً ایسے اختلافات موجود ہیں۔ وہ لوگ کیا ان اندرونی اختلافات کو اپنی پارٹی کے عام کارکنوں کے سامنے کھلم کھلا پیش کرتے ہیں اور ان کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔؟ نہیں وہ ایسا نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے لئے یہ ممکن ہے۔ وہ اپنے طریقۂ کار کے مطابق جوڑ توڑ اور سودا بازی کر کے یہ تمام باتیں کارکنوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ ان کے پرشکوہ جلسے خالی حزبی ڈھونگ اور ناٹک کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ بڑی تگ ودو کے بعد وہ اپنے اندرونی اختلافات کو چھپاتے ہیں اور اس طرح اپنی نظریاتی بے راہ روی پر پردہ ڈالتے ہیں۔ مگر اس سے نظریاتی کمزوری اور عوام کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کرنے کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ مغربی یورپ کی سوشل جمہوری جماعتیں جو کبھی انقلابی ہوا کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ سیاسی دباؤ کے تحت آخر کار ترمیم پسند ہوگئیں۔ اس کی ایک وجہ ان کی اصول سے سمجھوتہ بازی ہے۔

ہم مارکس کے نظریہ پر کاربند لوگ اس راستہ کو اختیار نہیں کر سکتے اور ایسا طریقہ اختیار کر کے ہم اپنے کو مضبوط اور منظم جماعت نہیں بنا سکتے۔ نظریاتی سمجھوتہ بازی ہمارے اصول کے خلاف ہے ایسی باتیں پارٹی کو کمزور اور مفلوج کر دیتی ہیں۔ پارٹی افسر شاہی کی سازشں کا شکار ہو جاتی ہے۔ محنت کش عوام سے پارٹی کو علیحدہ کر کے اسے ناکارہ بنا دیتی ہے۔ یہ راستہ ہمارا راستہ نہیں ہے۔

ہماری پارٹی کے ماضی کے تجربات یہ واضح طور پر ثابت کرتے ہیں کہ پارٹی کی تاریخ دراصل پارٹی کے اندرونی اختلافات کے خلاف جد وجہد اور ان مشکلات کے تدارک کے درمیان ہی پارٹی منظم ہو کر آہستہ آہستہ مضبوط بن کر ابھری۔

پارٹی کے ابتدائی دور کی تاریخ "اسکرا" کے زمانے کی باتیں اگر پارٹی کے دوسرے کانگریس کے زمانے پر بھی نظر ڈالی جائے، تو اس وقت کے واقعات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اندرونی اختلافات اپنے عروج پر تھے۔ سیاسی قیادتیں دو حصوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ لینن کی قیادت میں بالشویک تھے اور پلیکانوف، ایکسلروف، جاسولیک مارٹوف، پٹروسوف اور ایسے دوسرے لوگوں کی قیادت میں منشویک تھے۔ لینن ایسے پُر آشوب وقت میں تنہا ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ پلیکانوف اور اُس کے ساتھی جو لینن کی قیادت سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ ان کے اشارہ پر یہ آواز اٹھائی گئی تھی کہ پارٹی اس نقصان کو برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ شور و غوغا اگر آپ لوگ سنتے! مگر انقلاب کی تاریخ نے ہمیں یہ سبق دیا ہے اور پارٹی کی تاریخ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ تمام اندرونی اختلافات در حقیقت نظریاتی اختلافات تھے اور اس کی مخالفت خالص مارکسی پارٹی کی جنم کے لئے اور اس کو منظم و مضبوط کرنے کیلئے نہایت ضروری تھی۔ اس انقلاب کے تجربات سے ہم نے سیکھا ہے۔ اوّل یہ کہ پارٹی کے کارکنوں کی تعداد سے ان کی نظریاتی پختگی زیادہ اہم ہے۔ دوئم یہ کہ ظاہری اتحاد سے اندرونی اتحاد کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ لینن کے اصول ہی سچے تھے۔ پلیکانوف اور اُس کے حامیوں کے اصول غلطی پر مبنی تھے۔ تاریخ نے مزید یہ سبق دیا ہے کہ لینن اور نام نہاد "ناکام" "لیڈروں" کی مخالفت کو اگر اس طرح انقلابی جد وجہد کے ذریعہ ختم نہ کیا جاتا تو آج کی ہماری جو خالص انقلابی جماعت وجود میں آئی ہے۔ ایسا کبھی ممکن نہ ہو سکتا تھا۔

اس کے بعد ۱۹۰۵ء سے انقلاب کے پہلے تک کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ بالشویک اور منشویک ایک دوسرے کے مخالف کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک ہی پارٹی مگر ہر طرح سے دو علیحدہ جماعتوں میں بٹی ہوئی ہیں اور ان کی تنظیمیں بھی علیحدہ ہو گئی ہیں۔ اسی وقت بالشویک جماعت نے اپنی علیحدگی کا کھلم کھلا اعلان کر دیا اور اپنے انقلابی نظریہ کی ترویج کے لئے ایک اہم کانگریس (تیسری کانگریس) منعقد کرنے پر مجبور ہو گئی۔ بالشویک میں ایسی کیا بات تھی کہ جس کی وجہ سے پارٹی کے بیشتر کارکن ان کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ بالشویک جماعت نے کبھی بھی اختلافات کو پوشیدہ نہیں رکھا۔

اس کے بعد دوسرا سبق ۱۹۰۵ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد ۱۹۰۷ء کے واقعات ہیں۔ بالشویک کا ایک گروہ (آئیڈیلسٹ) بوگدانوف کی قیادت میں پارٹی کو چھوڑ کر علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ یہ زمانہ پارٹی کی زندگی کے لئے بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ یہ اُسی دور کی بات ہے جب کہ کچھ پرانے بالشویک لینن اور ان کی پارٹی کی قیادت کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی منشویک نے پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا کہ بالشویک کا چراغ گل ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں۔ بالشویک کے دن اب پورے ہو چکے ہیں مگر بالشویک کا چراغ نہیں بجھا اور یہ تقریباً ڈیڑھ برس کی مدت میں ہی ثابت ہو گیا۔ اس ڈیڑھ سال کی انقلابی جد وجہد کے تجربات نے یہ ثابت کر دیا کہ لینن اور ان کی پارٹی نے بالشویک کے اندرونی اختلافات کا جد وجہد کے ذریعہ تدارک کر کے صحیح طرز عمل اختیار کیا تھا۔ یہ انتظام پارٹی کے اختلافات کو چھپا کر نہیں کیا گیا بلکہ کھلے عام اور واضح طور پر بحث اور جد وجہد کے ذریعہ پارٹی کی بہتری اور ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے کیا گیا۔

مَیں اپنی پارٹی کے چوتھے سبق کے بارے میں بھی کچھ بتا سکتا ہوں۔ یہ ۱۲-۱۹۱۱ء کی بات ہے۔ رجعت پسندوں نے پارٹی کو توڑنے کی ہر ممکن کوشش جاری رکھی تھی ایسی حالت میں بالشویکوں نے سازشی لوگوں کو پارٹی سے نکالا پارٹی کو نئے سِرے سے منظم کیا۔ اس وقت بھی بالشویک نے سازشی لوگوں کے خلاف کھلے عام جنگ جاری رکھی اور پارٹی کی تنظیم کو مضبوط تر بنایا۔ بالشویکوں نے اندرونی اختلافات کو پوشیدہ نہیں رکھا۔

اس کے بعد پارٹی کی تاریخ سے پانچواں سبق اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے پہلے تک کے دَور میں ملتا ہے۔ اس وقت بالشویک کے کچھ لوگوں نے نام نہاد لیڈروں کی قیادت میں اکتوبر کے انقلاب کے بارے میں شک وشبہات کا اظہار کیا۔ ان لوگوں کی نظر میں اس انقلاب کا خیال "انتہا پسندوں کے انقلاب" کی سوچ تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کے اختلافات کو بھی بالشویکوں نے نہیں چھپایا بلکہ باہمی کھلی جد وجہد کے ذریعے اس کا تدارک کیا۔ اس انقلاب کے تجربات سے ہم جانتے ہیں کہ اس طرح سے ان اختلافات کا مناسب بندوبست ہوگا۔ اگر نہیں کیا جاتا تو اکتوبر کے انقلاب کو ایک زبردست آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا۔

پھر پارٹی کے اندرونی اختلافات کی تاریخ ۱۹۲۱ء میں ٹریڈ یونین پر مباحثہ اور اس کے نتائج ہیں۔ ان تمام واقعات کی تفصیل مَیں بیان نہیں کروں گا مگر یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ جس طرح انقلاب سے قبل ہمارے اندرونی اختلافات اور اس کے خلاف مسلسل جد وجہد جاری رکھنی پڑی بعد کے دَور میں بھی ٹھیک اسی طرح جد وجہد کے ذریعے ہمیں آگے بڑھنا پڑا۔ ان تمام باتوں سے ہم کیا سیکھتے ہیں؟

(۱) سوویٹ کمیونسٹ پارٹی (بالشویک) اندرونی اختلافات کے خلاف جد وجہد کر کے ہی ترقی کرتی رہی۔ اور طاقتور بنی۔

(۲) جد وجہد کے ذریعے ہی پارٹی کے اندرونی اختلافات کا تدارک کیا جا سکتا ہے۔

مغربی جمہوری جماعتوں کے پُرشکوہ جلسے ڈھونگ اور ناٹک ہیں

ایسی حالت میں کچھ لوگ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ "عام قانون" صرف سوویت پارٹی ہی کے لیے مخصوص ہے مگر یہ بات درست نہیں ہے۔ تمام ملکوں کی کمیونسٹ پارٹی کے لیے یہ عام قانون ہے .... پارٹی کو مضبوط تر اور منظم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اندرونی اختلافات کے مسئلوں کو حل کیا جائے۔ یہ انتہائی ضروری ہے۔ ماضی میں ہمیں جو کچھ کرنا پڑا آج بھی ہمیں وہی کچھ کرنا پڑ رہا ہے ۱۸۸۵ء ہی میں انگلس نے ایک جگہ کہا ہے

"اندرونی اختلافات آخر کار پوشیدہ نہیں رکھے جا سکتے۔ جدوجہد کے ذریعہ ہی اس کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے"

پارٹی کے اندرونی اختلافات کو ہم لوگ یقینی طور پر تسلیم کریں گے۔ اور ان اختلافات کو جدوجہد کے ذریعہ ختم کر کے پارٹی کو مضبوط و منظم کر لیں گے۔

پارٹی کے اندرونی اختلافات کی بنیاد

پارٹی کے اختلافات انفرادی سوچ و فکر کی وجہ سے جنم لیتے ہیں اس کی مجموعی وجہ کیا ہے؟

میرے خیال میں مزدوروں کی جماعتوں کے اندرونی اختلافات دو حالات کے تحت جنم لیتے ہیں۔ یہ حالات کونسے ہیں؟

پہلی وجہ یہ ہے کہ بورژوا سماج اور بورژوا نظریات مزدور طبقہ کے طبقاتی جدوجہد کے دوران ان کی پارٹیوں پر جو اثرات اور دباؤ ڈالتے ہیں یہ مزدوروں کے طبقہ کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور اسی لیے مزدوروں کے طبقہ کی پارٹی کا ایک حصہ بیشتر اوقات بورژوا اثرات کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ نظر انداز کرنے کی بات نہیں ہے کہ مزدور طبقہ بھی اسی سماج کے لوگ ہیں۔ وہ سماج سے بالکل علیحدہ نہیں ہیں۔ مزدور طبقہ اسی سماج کا ایک حصہ ہے۔ وہ مختلف گروہوں میں بٹے ہوتے کے باوجود لاتعداد بندھنوں میں سماج کے ساتھ منسلک ہیں۔ مگر پارٹی اور مزدور طبقہ جسم و جاں کی طرح ملے ہوئے ہیں۔ چنانچہ پارٹی ان تمام مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے بورژوا سماج اور ان کی بندشوں سے آزاد نہیں رہ سکتی۔ مختلف طریقوں سے سماجی بندشوں میں جکڑا ہوا خاص مزدور طبقہ بورژوا خیالات کے اثرات کے تحت ان کی سوچ و فکر، ان کے آداب، ان کی ثقافت بھی پارٹی پر اثر انداز ہوتی ہے اور ان کے ذریعے پارٹی میں یہ تضادات ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک ہی مزدور طبقہ میں مختلف گروہوں کے مزدور ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں مزدوروں کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی قسم اصلی خالص مزدور جو نسل در نسل مزدور ہوتا ہے۔ یہی لوگ مزدور طبقہ کے مستقل جز ہیں۔ بہت دنوں سے بورژوا طبقہ نے ان کو علیحدہ کر رکھا ہے۔ مارکسی نظریہ کے تحت سب سے زیادہ قابلِ اعتماد مزدور فوج یہی لوگ ہیں۔

دوسری قسم میں کسان طبقہ یا پیٹی بورژوا یا پھر دانشوروں کے اندر سے آنے والا مزدوروں کا گروہ ہے۔ ان کا تعلق پہلے کسی اور طبقہ سے تھا۔ ابھی ابھی مزدور طبقہ کے ساتھ متحد ہوا ہے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ مزدور طبقہ میں اپنے ماضی کے کلچر، عادات، دو غلا خیالات اور شک و شبہات لے آتے ہیں۔ یہ اندازِ فکر انفرادی انانیت، نیم انانیت اور انتہا پسند بائیں بازو کی سیاست کی بنیاد بن کر ابھرتی ہے — !

تیسری اور آخری قسم وہ ہے جو خود کو اعلیٰ خاندان سے بتاتا ہے۔ یہ مزدور کے بالائی حصّہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کی خاصیت یہ ہے کہ وہ بورژوا کے ساتھ مفاہمت کے لیے ہمیشہ ہاتھ بڑھائے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی یہ روش رہی ہے کہ جو بھی حکومت پر قابض ہو اس کے ساتھ مل جائیں۔ یہ لوگ انفرادی خواہشات اور آرام و آسائش کے بیمار ہوتے ہیں۔ یہ طرز عمل ترمیم پسندوں اور موقع پرستوں کا ہے۔

پارٹی کے اندرونی اختلافات صرف جدوجہد سے ہی ختم کئے جا سکتے ہیں

آخرالذکر دونوں قسموں کے درمیان فرق ہونے کے باوجود ایک چیز دونوں میں مماثلت رکھتی ہے وہ کم و بیش موقع پرست لیڈروں کی حمایت کا باعث بنتی ہے۔ جب بالائی حصہ کے مزدوروں کے خیالات اہمیت حاصل کر لیتے ہیں تو موقع پرستی کھلم کھلا اپنا اظہار کرتی ہے جب پیٹی بورژوا جو کہ خود ابھی پیٹی بورژوا اثرات سے نجات نہیں حاصل کر سکے ہیں، حکومت پر قابض ہوتے ہیں تو نقلی بائیں بازو بن جاتے ہیں۔ انتہا پسند بائیں بازو کے حمائتی اکثر ظاہری موقع پرستوں کے ساتھ مل جاتے ہیں یہ قطعی تعجب کی بات نہیں۔ لینن نے بار بار فرمایا ہے کہ انتہا پسند بائیں بازو کے حمایتی وہ لوگ ہیں جو دائیں بازو منشیوک کا دوسرا حصہ ہے یہ بالکل سچی بات ہے۔

انتہا پسند بائیں بازو کے لوگ "کل ہی انقلاب ممکن ہو گا" کی تمنا کر کے جب دیکھتے ہیں کہ انقلاب میں ابھی دیر ہے "کل ہی انقلاب نہیں ہو رہا ہے" تو وہ لوگ ناامید ہو جاتے ہیں اور انقلاب پر ان کا یقین ختم ہو جاتا ہے — !

عام طور پر طبقاتی جدوجہد کے دور میں انقلاب جب تیز سے تیز تر ہونا شروع ہوتا ہے تو اختلافات اور بھی ابھر آتے ہیں۔ مزدور طبقہ کی مختلف قسموں میں مختلف خیالات، کلچر اور اندازِ فکر پارٹی کے اندر ظاہر ہونے لگتے ہیں اور پھر پارٹی میں اختلافات کی وجہ بن جاتے ہیں۔ یہ ذہنی اختلافات بورژوا کی مدد سے اور بھی مضبوط ہو کر مزدور طبقہ کی پارٹی میں آخرکار اندرونی اختلافات کی جدوجہد کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ پارٹی کے اندرونی اختلافات کی جدوجہد کی یہی بنیاد ہے۔

اندرونی اختلافات اور ذہنی بے راہ روی پر کیا ہم قابو پا سکتے ہیں؟ نہیں، ایسا نہیں کر سکتے ہیں۔ ان پر قابو پانے کی فکر "خود فریبی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انگلس نے سچ کہا ہے —— آخر کار پارٹی کے اندرونی اختلافات پوشیدہ نہیں رکھے جا سکتے جدوجہد کر کے ہی اس کو شکست دی جاتی ہے" مگر اس سے پارٹی کو جھگڑے کا گھر سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پارٹی دراصل مزدور طبقہ کی انقلابی جماعت ہے۔ میں جو کچھ بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پارٹی کے ذہنی اختلافات دبا کر نہیں رکھے جا سکتے یا آنکھیں بند کر کے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صورت میں اختلافات نظریاتی بن جاتے ہیں۔ میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ مزدور طبقہ کی پارٹی کو مارکسی اصولوں پر منظم کرنا بورژوا خیالات اور اثرات سے نجات حاصل کرنا، انقلاب اور صرف انقلاب کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ پارٹی کے اندرونی اختلافات کو حل کر کے ہی ہم پارٹی کو مضبوط و منظم کر سکتے ہیں

اسمِ اعظم

واحد بشیر

میرے چاروں طرف
سر بریدہ بدن
اپنے سفاک قاتل سے نا آشنا
سمتِ منزل کی جن کو نہیں ہے خبر
کوچۂ و شہر میں کھیت کھلیان میں
ہر قدم اِک نیا زخم کھاتے ہوئے
حوصلے قاتلوں کے بڑھاتے ہوئے

پیچ در پیچ راستوں پر رواں
ایک مُدت سے ہیں
جانے کب تک رہیں !
میرے چاروں طرف
سر بریدہ بدن
دیکھنے میں تو وہ سر بریدہ نہیں
بارِ افلاس نے گردنیں توڑ دیں
کان صرفِ تسلّی کو ترسا کئے
اور بہرے ہوئے
جبر و تعزیر نے
کاٹ لی ہے زباں
اور بھلے وقت کا
راستہ دیکھتے
آنکھیں پتھرا گئیں
یوں بدن پر اگر سر ہوئے بھی تو کیا !
میرے چاروں طرف
سر بریدہ بدن
سر بریدہ سہی، سرد لاشیں نہیں
زندگی سے انہیں تو بہت پیار ہے
یہ مشینیں نہیں، یہ فرشتے نہیں۔
جو کہ عاری ہوں احساس و ادراک سے

بس انہیں خوف و اندیشہ کا
اِک طلسمِ خیالی ہے جکڑے ہوئے۔
اِس طلسمِ خیالی کا اِک توڑ ہے
اسمِ اعظم پڑھو ! اسمِ اعظم پڑھو
اسمِ اعظم یہ ہے :
سر بریدہ تنوں میں رواں

اے لہو !
گرم ہو۔ گرم ہو
تجھ سے ہر ایک تخلیق کی زندگی
تجھ سے ہے نظمِ عالم کی تابندگی

اے لہو !
گرم ہو۔ تیز رفتار ہو
ظُلم کی برف اب تو پگھلنے کو ہے
اک سورج نیا اب نکلنے کو ہے !
زندگی اِک نیا رُخ بدلنے کو ہے !
اے لہو ! گرم ہو۔
تلخ گفتار ہو۔
برملا اپنے قاتل کا اب نام لے
چاک کر پردۂ جبر کو، مکر کو !
اے لہو !
اپنا حق چھین لے۔
کوچہ و شہر سب تیرے گھر ہیں، تیرے گھر ہیں
کھیت کھلیان سب تیرے ہیں، تیرے ہیں
مُلک یہ تیرا ہے !
یہ زمیں تیری ہے !
اور غاصب کا حق
اِس زمیں پر فقط
قبر ہے۔ قبر ہے۔

جماعتی گزٹ جسارت کا پردہ چاک

عوام سے رقم بٹورنے والے

فن صحافت پر بدنما دھبہ ہیں



بھیک مانگنے کا فن جماعتِ اسلامی پر ختم

نعیم الحسن

جماعتِ اسلامی کے بھونپو روزنامہ "جسارت" نے جس کی اشاعت خیر سے ان دنوں ہزار ڈیڑھ ہزار سے کچھ بڑھ گئی ہے، اپنے قارئین سے پردرد اپیل کی ہے کہ: پریس کی تنصیب میں دل کھول کر چندہ دیں ——— اور اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں ——— جہاں تک چندہ مانگنے کا فن ہے تو ہمیں اعتراف کر لینا چاہیئے کہ یہ جماعتِ اسلامی اور اس کے بغل بچہ اداروں اور تنظیموں پر ختم ہے۔ اس جماعت کا سارا کاروبار لین دین، وصولی اور ادائیگی، چندے اور بیرونی امداد کے سہارے آگے بڑھا ہے۔ پاکستان کی یہ واحد جماعت ہے جس نے دسمبر کے عام انتخابات میں ساڑھے چار کروڑ روپے یوں لٹائے جیسے وہ روپے نہ ہوں، سڑک پر پڑے ہوئے ٹھیکرے اور کنکر ہوں۔

بھونپو جسارت نے بڑے ڈرامائی انداز میں پریس کی تنصیب کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا اعلان کیا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد مغربی پاکستان کاغذ کی قلت کا شکار ہے۔ تقریباً سارے اخبارات ہفت روزے اور ماہنامے اس بحران میں مبتلا ہیں۔ جسارت نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے متعلقہ انتظامیہ پر الزام عائد کیا کہ "اسے کاغذ نہیں دیا جا رہا ہے تاکہ اخبار بند ہو جائے" اس پراپیگنڈہ کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے مالکانِ اخبارات کی انجمن کی طرف سے ایک قرارداد بھی منظور کرائی گئی۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ مالکانِ اخبارات اور جماعتِ اسلامی کی دُم ایک دوسرے سے بندھی چلی آ رہی ہے لہٰذا ہرفِ غلیظ نامہ جسارت" کے حق میں مالکان اخبارات کی انجمن کی قرارداد سے دوسرے اخبارات اور عوام کو کوئی حیرت نہ ہوئی۔

جھوٹ کے پلندہ جسارت نے اس ڈرامہ میں مزید رنگ بھرنے کے لیے مسلسل ایک ہفتہ تک اپنے اداریہ میں مقتول بیوہ کی طرح آنے والے خطرے کا خوف دلا کر بین کیا۔ ——— "بس اب اخبار بند ہونے والا ہے، حق گوئی کے جرم میں پیپلی ایڈیٹر دار پر کھینچا جانے والا ہے ——— وغیرہ ——— وغیرہ ——— !" ——— ہم بھی تذبذب کے شکار ہو گئے کہ شاید اس جماعتی گزٹ پر کوئی بُرا وقت آنے والا ہے ——— اگر ایسا ہُوا تو کئی صحافی اور دوسرے پریس کارکن بلاوجہ مارے جائیں گے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ جماعتِ اسلامی کی غلیظ اور مکر و فریب کی سیاست کی سزا بیچارے عامل صحافی اور پریس کے کارکن بھگتیں چند ہفتے گزرنے کے باوجود جب حکومت کی جانب سے اس اخبار کے خلاف کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ اور یہ جماعتی گزٹ بدستور ہزیان اور اول فول بکتا رہا تو یہ عقدہ کھلا کہ دراصل اس پراپیگنڈہ کی آڑ میں روپیہ بٹورنے کی مہم چلائی گئی ہے۔ پریس کی تنصیب کے سلسلے میں چندے کی اپیل شائع کرنے سے ایک دو روز قبل تو اس اخبار نے تمام صحافتی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر اداریہ کے کالم کو سادہ چھوڑ دیا۔ گویا عوام پر یہ تاثر قائم کرنے کی ناپاک جسارت کی گئی کہ حکومت نے صرف اس اخبار پر زباں بندی کی تلوار لٹکا رکھی ہے۔ شاید کل سے یہ اخبار بند ہو جائے گا اور اس کا ڈرھیل مدیر پابندِ سلاسل کر دیا جائے گا لیکن توقع کے برعکس دوسرے دن بھی یہ اخبار بمعہ داڑھی پوری خباثت کے ساتھ نمودار ہُوا۔ اس روز منصوبے کے مطابق اخبار کے ایک طرف چندے کی اپیل کا اشتہار شائع کیا گیا جس میں بڑے دردناک انداز سے انکشاف کیا گیا کہ حکومت اس اخبار کو اس کی حق گوئی (واضح رہے کہ اس اخبار نے حق گوئی کی بجائے ہمیشہ دروغ گوئی کا ریکارڈ قائم کیا) کی سزا اس صورت میں دے رہی ہے کہ جسارت کا پریس ٹرسٹ میں چھپنا بند کر دیا گیا ——— یہ شوشہ قصداً چھوڑا گیا تھا تاکہ حقائق سے بے خبر عوام کے جذبات کو اُبھارا جا سکے۔ لیکن اصل حالات کچھ اور تھے۔

جسارت پر پریس ٹرسٹ کے ہزاروں روپے کے واجبات نکلتے تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں نوٹس جاری کرنے کے باوجود جسارت کی انتظامیہ نے انتہائی بے شرمی اور

جسارت نے کالا روپیہ چھپانے کے لئے چندے کی اپیل شائع کی ہے

ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے واجبات کی ادائیگی روک رکھی تھی۔ جماعتی گزٹ نے اپنی سابقہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس موقع سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور پریس ٹرسٹ کے اس نوٹس کو صفحہ اول پر چھاپ کر قارئین سے نجی پریس کی تنصیب کے لیے چندے کی اپیل شائع کر دی واقعات اور حالات اس بات کے گواہ ہیں کہ جماعتی گزٹ کو حکومت کی جانب سے کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔ بلکہ اس نے محض عوام کو فریب دینے کے لیے جھوٹ گڑھا تھا۔

کیا جماعتی گزٹ "جسارت" واقعی عوام کی امداد کا محتاج ہے؟

جماعتِ اسلامی، اس کی ذیلی تنظیمیں اور اخبارات عوامی امداد کے ہرگز محتاج نہیں ہیں۔ عوام سے چندے کی اپیل محض دکھاوا ہے، ڈھونگ ہے، لوگوں کو بیوقوف بنانے کا پرانا جماعتی ہتھکنڈا ہے۔ جماعتِ اسلامی کے پاس وافر فنڈ موجود ہے۔ بیرونی امداد کے علاوہ ۲۵ سال سے آنے والی حکومتوں اور اس ملک کے بڑے سرمایہ داروں کی اسے سرپرستی حاصل رہی ہے۔ اس کا واضح ثبوت ایوب اور یحییٰ خان کے دور سے ملتا ہے۔ یحییٰ خان نے اس جماعت کی گندی سیاست سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہمیشہ اس کی امداد کی۔ جماعتی ہفت روزہ "زندگی" اور "اردو ڈائجسٹ" کو ۲۵ ہزار روپے کنونشن لیگ کے فنڈ سے عطا کیے۔ اور ہدایت کی کہ اس میڈیا کے ذریعے مشرقی اور مغربی پاکستان میں نفرت اور تعصب کو ہوا دی جائے۔ یہ بات قومی اسمبلی کے اجلاس اور پریس میں بھی آچکی ہے۔ یہاں تک کہ ہفت روزہ "زندگی" اور "اردو ڈائجسٹ" کے نام سے جاری کیے گئے چیک کے نمبر بھی اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں اور جس کی تردید آج تک نہیں کی گئی۔

جماعتِ اسلامی کے پاس اتنا فنڈ ہے کہ وہ پاکستان کے تمام اخبارات، ہفت روزے اور ماہنامے اپنے فنڈ سے چلا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ آسانی سے اعلیٰ قسم کا پریس بھی لگوا سکتی ہے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب جماعتِ اسلامی کی سرپرستی میں چلنے والے اخبارات کے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ وہ پریس کے تمام اخراجات برداشت کر سکتے ہیں تو چندے کی اپیلوں کا سلسلہ کیا معنی رکھتا ہے؟ یہی وہ نازک مقام ہے جس پر جماعت بڑی عیاری اور مکاری سے پردہ ڈال دیتی ہے۔ دراصل وہ اپنے سرپرستوں سے ملنے والی امداد کو چھپانے کے لیے چندے اور عطیات کا بہانہ بناتی ہے ہر سال بقرعید کے موقع پر وہ قربانی کی کھالیں بھی اپنی سیاہ امداد کو خفیہ رکھنے کے لیے جمع کرتی ہے۔ آپ کے علم میں یہ بات ہوگی کہ ہر سال مہنگائی کی وجہ سے گزشتہ سال کی نسبت قربانی کی شرح میں کمی واقع ہوتی رہتی ہے لیکن جماعتِ اسلامی کے ترجمان کی طرف سے ہر سال گزشتہ سال کے مقابلہ میں زیادہ کھالیں جمع کرنے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس طرح جماعتی مقاصد پر بے تحاشہ روپیہ لٹانے کا جواز یہ کہہ کر نکالا جاتا ہے کہ ——— "دین کی راہ میں امت کا پیسہ خرچ کرنا گناہ نہیں، عین ثواب ہے۔"

جماعتی گزٹ جسارت کے پاس بھی اتنا فنڈ موجود ہے کہ بڑی آسانی سے اپنے پریس کا انتظام ہو سکتا ہے لیکن جماعتی عملہ کو اس بات کا خوف لاحق ہے کہ اگر اس نے پریس لگوا لیا تو حکومت اور عوام یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ایک ادارے کے پاس دس بارہ لاکھ روپیہ کہاں سے آگیا جو اپنے کارکنوں کو وقت پر تنخواہیں اور پریس ٹرسٹ کے بقایاجات ادا نہیں کر سکتا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس جماعتی پمفلٹ کے کئی صحافیوں اور کارکنوں کو وقت پر تنخواہ ادا کرنے کے مطالبہ کے جرم میں کان پکڑ کر باہر نکال دیا گیا۔

ایک طرف مودودی جماعت کا یہ گھناؤنا کردار ہے دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزاد کے کردار کو بھی دیکھئے جنہیں یہ "جماعتیے" ہمیشہ بُرا بھلا کہتے آئے ہیں ——— جب "الہلال" شائع ہوا تو ایک سرمایہ دار نے مولانا کو ایک مکتوب میں لکھا کہ "میں اردو اخبار جاری کرنا چاہتا تھا، آپ نے ایک اعلیٰ پائے کا اخبار جاری کر دیا ہے اس لیے میں آپ کی ذمہ داریوں میں تھوڑا سا تعاون کرنا چاہتا ہوں۔ ایک چیک ارسال ہے آئندہ بھی اتنی ہی رقم ماہانہ پہنچتی رہے گی اور اگر "الہلال" ایک سال تک اپنا خرچ پورا نہ کر سکا تو یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔"

مولانا نے یہ چیک واپس کر دیا اور "الہلال" میں اس سرمایہ دار کے مکتوب کے جواب میں لکھا:۔

"ہمارے عقیدے میں جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی رقم لینا جائز رکھتا ہے وہ اخبار نہیں بلکہ فنِ صحافت کے لیے ایک دھبہ اور سراسر عار ہے۔ ہم اخبار نویس کی سطح کو بلند دیکھتے ہیں اور امر بالمعروف بعینہٖ من المنکر کا فرضِ الٰہی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں پس! اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیئے ——— چاندی اور سونے کا تو سایہ بھی اس کے لیے سمِ قاتل ہے جو اخبار نویس رئیسوں کی ضیافتوں اور امیروں کے عطیوں کو قومی امانت، قومی عطیہ اور اس طرح کے فرضی ناموں سے قبول کرتے ہیں۔ وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نورِ ایمان کو فروخت کریں بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر قلندروں کی کشتی کی جگہ قلم دان لے کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور ہر گلی کوچے میں ——— "کام ایڈیٹر کا" کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے رہیں۔"

'ہم محاذ پر دشمن سے لڑنے جا رہے ہیں'



چھن چھانگ فنگ

ترجمہ: احفاظ الرحمٰن

جب میں کنارے اتر کر اپنے گھر کی طرف چلا تو پورا ہجوم میرے ساتھ تھا۔ اس رات میرے گھر پر کوئی عوامی میٹنگ ہو رہی تھی۔ گاؤں کے تمام لوگ وہاں موجود تھے، جن میں گاؤں کی سوویت کا صدر بھی شامل تھا۔ انہوں نے مجھ سے سرخ فوج کے حالات پوچھے۔ جب میں انہیں یہ بات بتا رہا تھا تو میرے والد میری طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے جاتے۔ میں نے پہلی بار ان کے چہرے پر اتنی پُرسکون مسکراہٹ دیکھی تھی۔

جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ میں صدر ماؤ کا باڈی گارڈ ہوں تو ان کی دلچسپی میں اور اضافہ ہو گیا اور وہ اصرار کرنے لگے کہ میں صدر ماؤ کے بارے میں زیادہ باتیں بتاؤں۔

"صدر ماؤ بالکل ہم جیسے عام انسان ہیں۔" میں نے کہا۔

لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور اس بات پر مصر رہے کہ میں اور باتیں بتاؤں۔ ہم صبح تک باتیں کرتے رہے۔

نویں دن میں صدر ماؤ سے ملنے کے لئے چھانگ تنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ مرکزی ہسپتال میں ہیں۔ یہ سن کر میں پریشان ہو گیا۔ کہیں وہ بیمار تو نہیں پڑ گئے؟ میں بھاگتا ہوا ہسپتال پہنچا، لیکن وہ خیریت سے تھے اور تشویش کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے انہیں کچھ مونگ پھلی اور شکر قند پیش کی جو میرے والد نے ان کے لئے تحفے کے طور پر روانہ کی تھیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے یہ تحفہ قبول کر لیا، اور پوچھا،

"تمہارے گھر والے کیسے ہیں؟"

"اب وہ لوگ خوش گوار زندگی بسر کر رہے ہیں۔" میں اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا اور میں نے انہیں تمام سرگزشت سنا ڈالی۔

"اب ہمارے گاؤں میں سوویت نظام قائم ہو چکا ہے۔ تمام زمینداروں اور ظالموں کے سر کچل دیئے گئے ہیں۔ میرے گھر والوں کو تین کمروں کا مکان اور سولہ موزمین مل گئی ہے۔"

صدر ماؤ نے پسندیدگی کے انداز میں سر ہلایا، "بہت خوب!"

پھر انہوں نے پوچھا، "تمہارے گاؤں کی سوویت کا صدر غریب شخص ہے یا امیر؟"

"ایک غریب شخص، جس نے ہمارے خاندان کی طرح ماضی میں بہت دکھ جھیلے ہیں۔"

وہ گاؤں کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے تھے۔ آخر

صدر ماؤ نے کہا کیا تم سمجھتے ہو ہم ہی



انہوں نے کچھ سنجیدہ اور کچھ مزاحیہ سے لہجے میں پوچھا۔
" تمہارے والد کو تمہارے لئے کوئی ماں ملی، یا نہیں۔ ؟"

ان کی یادداشت غضب کی تھی۔ جب میری ان سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی تو میں نے انہیں بتایا تھا کہ میری والدہ کا انتقال ہوچکا ہے۔ اور اس بات کو تین سال سے بھی زائد عرصہ ہوچکا تھا!

" جی ہاں " پڑوسیوں نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ایک نئی طرز کی اور باہمی پسند کی شادی تھی " صدر ماؤ کے لبوں پر ایک پرسکون مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

لانگ مارچ کا پہلا قدم

۱۹۳۴ء کے موسم گرما کے آغاز میں شاچھو پا کے مقام پر صدر ماؤ کی صدارت میں مالی اور معاشی مسائل کے متعلق ایک کانفرنس منعقد ہوئی، جس کے بعد وہ دیہی علاقوں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے صوبہ چیانگشی کی کاونٹی ژوئی چن کے قصبے وویانگ میں چلے گئے جو پیداوار کے اعتبار سے ایک مثالی علاقہ تھا وہاں سے وہ ہوئی چھانگ کاونٹی گئے جو کوانگ تنگ، چیانگشی کی پارٹی کی صوبائی کمیٹی کا مرکز تھا اور وہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد یو تو چلے گئے۔ اگست میں وہ کاؤپی ناؤ واپس آ گئے جو ژوئی چن کے قریب واقع ہے اور جہاں وہ اس وقت متعین تھے۔ وہ کئی ماہ تک بہت مصروف رہے وہ گردونواح کے علاقوں میں جا کر ذمے دار کارکنوں کی میٹنگیں بلاتے یا دیہی علاقوں کے حالات کا جائزہ لیتے۔

صورتحال بہت سنگین تھی کیونکہ دشمن نے اپنی گھیرے کی پانچویں مہم شروع کر دی تھی۔ دشمن کے طیارے جو بس گھنٹے ہمارے سروں پر منڈلاتے رہتے اور بلا امتیاز تمام علاقوں پر بم برساتے رہتے۔

ان دنوں صدر ماؤ اور زیادہ مصروف ہو گئے تھے وہ ایک پہاڑی پر ایک بڑے مندر میں کامریڈ شیئہ چھو ہیہ ژائے کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ دن کے وقت انہیں فوجی کونسل کی میٹنگ میں شرکت کرنے کیلئے روزانہ پہاڑی کے نیچے اترتے وقت تقریباً تین لی پیدل چلنا پڑتا۔ واپس آنے کے بعد وہ رات گئے تک تحریری کام کرتے تھے اکثر وہ رات گئے اپنی تحریریں میرے حوالے کرتے کہ میں انہیں نائب صدر چو این لائی (جو اس وقت کسانوں کی مرکزی جمہوری حکومت کے نائب صدر تھے) اور دوسرے لیڈروں کو دے آؤں۔ ان دستاویزات کے موضوع کے بارے میں اس وقت تک کچھ علم نہیں ہوا۔ جب تک کہ انہیں سرخ اور سبز رنگ کے کاغذ پر کتابچے کی صورت میں شائع کر نہیں دیا گیا۔ ان کا موضوع، گوریلا جنگ کی تدابیر کے مسائل تھا۔

روزانہ بہت سے لوگ پہاڑی پر آیا کرتے تھے۔ جہاں ہم رہتے تھے، صدر ماؤ کی طبعیت کچھ اچھی نہیں تھی۔ اکثر وہ کچھ بھی نہیں کھاتے اور بہت کم سوتے تھے۔ ان کا وزن بہت کم ہو گیا تھا۔ ہم باڈی گارڈ ان کے لئے بڑے فکرمند تھے لیکن ہم کیا کر سکتے تھے؟ جب کبھی ہم انہیں آرام کرنے کا مشورہ دیتے تو وہ اپنی ڈیسک پر پڑے ہوئے کاغذات کے پلندوں کی طرف اشارہ کر کے کہتے " ذرا اس کام کو ختم کر لوں، اس کے بعد آرام کروں گا، ٹھیک ہے!؟ " جیسے وہ ہم سے مشورہ لے رہے ہوں۔ بہرحال ان دستاویزات کا کام کبھی ختم نہ ہوتا کیونکہ ہر آن نئے نئے پلندوں کا تانتا بندھا رہتا۔ ہمیں یہ فکر رہنے لگی کہ ان کے لئے ایک ڈاکٹر کا انتظام ہونا چاہیئے۔

ایک شام کھانے کے بعد جب صدر ماؤ مندر کے سامنے والی سیڑھیوں پر کھڑے کسی سوچ میں گم تھے کہ امور عامہ کے ڈائریکٹر کامریڈ یوان فوچنگ اور مرکزی ہسپتال کے ایک رہنما کامریڈ وہاں آئے۔ میں انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ لوگ صدر ماؤ کے لئے کسی ڈاکٹر کا انتظام کرنے آئے ہیں۔ میں یہ جانتا تھا کہ بیمار کو، خواہ وہ کوئی ہو، ڈاکٹر کا حکم ماننا ہی پڑتا ہے۔

انہوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور باتوں میں مصروف ہو گئے۔ میں ایک طرف کھڑا تھا کہ جیسے ہی موقع ملے یہ بات ان کے کان میں ڈال دوں کہ انہیں صدر ماؤ کے لئے ایک اچھے سے ڈاکٹر کا انتظام کرنا چاہیئے۔ ڈائریکٹر یوان نے سب سے پہلے ایک ذاتی ملازم رکھنے کی بات چھیڑی۔ ڈاکٹر کا کیا بنے گا؟ میں مضطرب ہو گیا۔ آخر بہت دیر کے بعد یوان نے کہا۔

" جناب صدر! ہم نے آپ کے لئے ایک اچھا سا ڈاکٹر تلاش کر لیا ہے، وہ آپ کے ساتھ رہے گا۔"

میں اچھل پڑا اب ہوئی نہ بات " بہت خوب! میں ایک دم پکار اٹھا۔ " اسے جلدی سے صدر ماؤ کے پاس بھیج دیجئے "۔

اس کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اپنے بڑوں کے سامنے مجھے اس طرح بات نہیں کرنی تھی اور میں جھینپ گیا۔

صدر ماؤ نے میری طرف دیکھا اور پھر ڈائریکٹر یوان اور ان کے ہمراہی پر نظر ڈالی۔ انہوں نے سگریٹ جلاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

" میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر ضروری نہیں ہے، نرس کافی ہے — صرف حرارت دیکھنے اور انجکشن لگانے ہی کا کام تو ہے —"

" جناب صدر! " یوان نے انہیں اپنی بات مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا۔

" آپ کی موجودہ حالت کے پیش نظر، میرے خیال میں ڈاکٹر زیادہ ضروری ہے، اور ہم پہلے ہی —"

" نہیں " صدر ماؤ نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

" فوج کو ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس پہلے ہی ڈاکٹروں کی کمی ہے۔ میں اپنے لئے ایک ڈاکٹر کو کیسے وقف کر سکتا ہوں؟ " پھر انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ " میری صحت خراب نہیں ہے کیا ایک نرس سے کام نہیں چل سکتا؟ "

ڈائریکٹر یوان اور دوسرے کامریڈ کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن چونکہ وہ صدر ماؤ کے مزاج سے واقف تھے، اس لئے انہوں نے اصرار نہیں کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے چلے گئے۔

چند دنوں کے بعد ایک نوجوان شخص جو تقریباً اٹھارہ برس

قلاب کے اجارہ دار نہیں“

کا تھا۔ ادویات کا تھیلا اٹھائے جس پر ریڈ کراس کا نشان لگا ہوا تھا۔ وہاں آپہنچا۔ اس طبی اردلی کا نام چھونگ فوچھانگ تھا۔ اسے طویل مارچ کے دوران ہر وقت صدر ماؤ کے ساتھ رہنا تھا۔

اسی زمانے میں صدر ماؤ نے ہمیں یہ حکم دیا کہ ہم محاذ پر جانے کے لئے ہلکے قسم کے ساز و سامان سے لیس ہو جائیں دہمیں اس بات کا گمان تک نہیں تھا کہ وہاں سے ہم شمالی شینسی کی طرف لانگ مارچ شروع کرنے والے ہیں) ہم (باڈی گارڈ) بہت حیران ہوئے۔ اس دفعہ ہلکے ساز و سامان کے بارے میں اس قدر تاکید کیوں کی گئی تھی۔ ؟

خود صدر ماؤ نے اپنا نو خانوں والا سفری تھیلا تک نہیں لیا۔ ان کا سارا سامان صرف دو کمبلوں، ایک سوتی چادر، ایک موم جامہ، ایک بوسیدہ کوٹ، ایک ٹوٹی پھوٹی چھتری اور کتابوں کے ایک پلندے پر مشتمل تھا۔

”ہم محاذ پر لڑنے جارہے ہیں!“ ہر طرف جوگر ماگرم بحث ہو رہی تھی، اس کا نچوڑ بس یہی تھا۔

ستمبر کے اواخر میں ہم صدر ماؤ کے ساتھ کا ڈپی نا ؤ سے یوتو کی طرف روانہ ہوئے۔

۱۸ ر اکتوبر ۱۹۳۴ء چینی انقلاب کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش دن ہے۔ اس دن شام پانچ بجے کے بعد ہم تقریباً بیس آدمی صدر ماؤ کے ساتھ یوتو کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ لانگ مارچ کا پہلا قدم تھا۔

یوتو کے شمالی دروازے سے نکل کر مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے، ہم ایک چوڑے دریا کے کنارے پہنچے اور بہاؤ کی مخالف سمت میں چلنے لگے۔ مٹیالا، جھاگ اڑاتا پانی زور زور سے دھاڑ رہا تھا۔ غروب آفتاب کے بعد سرد ہوائیں چلنے لگیں۔ صدر ماؤ کے جسم پر اوورکوٹ تک نہیں تھا۔ انہوں نے صرف خاکی وردی اور سرخ فوج کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ لیکن وہ سب سے آگے تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے چل رہے تھے۔

ہم یوتو سے بیس لی پیچھے تھے کہ اچانک ہمیں شور سا سنائی دیا اور دور کچھ روشنیاں سی دکھائی دیں۔ طبی اردلی چھونگ فوچھانگ اور میں اس صورت حال کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

”یہ ہماری فوجیں ہیں۔“ صدر ماؤ نے ہمیں بتایا۔

”ہماری فوجیں ؟“ میں چکرا گیا۔ جب ہم یوتو سے روانہ ہوئے تھے تو ہمیں ایک بھی سپاہی نظر نہیں آیا تھا۔ اچانک یہاں اتنے سارے لوگ کہاں سے آگئے۔ ؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

جب ہم دریا کے قریب پہنچے تو ہمیں دونوں کناروں پر انقلابی فوج کے بے شمار سپاہی نظر آگئے۔ ہر طرف ایک شور سا برپا تھا ایک سرے سے دوسرے تک ہزاروں مشعلیں ادھر سے ادھر گھومتی نظر آرہی تھیں اور گانے، ہنسنے اور ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چوڑے دریا کے اوپر کشتیوں کا پل باندھ دیا گیا تھا اور اس پر فوجی دستوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

میرے لئے یہ منظر بڑا ولولہ انگیز تھا۔ میں دوڑ کر صدر ماؤ کے پاس پہنچا۔ ”ہمارے پاس اتنی ساری فوج کہاں سے آگئی؟“ میں نے ذرا بلند آواز میں ان سے سوال کیا —— وہ مسکرائے —— ”یہی نہیں ہے۔“ انہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”بہت سی فوج اس سے آگے جا چکی ہے!“

ہم نے صدر ماؤ کے ساتھ دریا کے پل کو عبور کیا۔ پل پر گھڑ سوار سپاہیوں، پیادہ فوجیوں اور سامان اٹھانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں دیہاتیوں کا ایک بہت بڑا ہجوم موجود تھا جو انہیں رخصت کرنے کے لئے وہاں جمع ہوئے تھے۔ صدر ماؤ کو بار بار دوسروں کو رستہ دینے کے لئے رکنا پڑتا۔

آدھی رات کے قریب ہمیں مخالف سمت سے ایک اسٹریچر آتا دکھائی دیا۔ جس پہ ایک زخمی سپاہی سوار تھا۔ سڑک پر کھڑے ہوئے دیہاتی بہت مضطرب اور بے چین نظر آنے لگے۔

”کوپی اور شن تھیَن پر بہت جلد ہمارا قبضہ ہو جائے گا۔“ آنے والوں نے ہمیں بتایا۔

صدر ماؤ اسٹریچر کے پاس گئے اور زخمی کے اوپر پڑے ہوئے کپڑے کو کھینچ کر اچھی طرح ڈھانپ دیا —— ”کامریڈ! تمہارا زخم زیادہ مہلک تو نہیں۔“ انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ”اسٹریچر میں لیٹے



ماؤ علاقے میں

ی کے
جُود
ماؤ
کٹر
نکیش
زادی

سوویت نظام میں تمام زمینداروں اور ظالموں کا سر کچل دیا گیا

ہوئے شخص نے مشعل کی روشنی میں بڑے غور سے صدر ماؤ کی طرف دیکھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت متاثر ہوا ہے۔ "زیادہ مہلک نہیں ہے"، اس نے جواب دیا۔ "میں بہت جلد محاذ پر لوٹ آؤں گا!"

اسٹریچر آگے نکل گیا لیکن صدر ماؤ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے دیر تک اس پر نظریں گاڑے رہے۔

سورج نکلنے سے کچھ پہلے دیہاتیوں کا ایک ہجوم مخالف سمت سے آتا ہوا نظر آیا۔ ان سے قریب قریب ہر شخص نے ایک وزنی بوری اٹھا رکھی تھی۔

"آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں؟" میں نے آگے بڑھ کر ان سے پوچھا۔

"کوپی اور شن ہتھین پر قبضہ ہو گیا ہے!" انہوں نے ایک آواز ہو کر کہا۔

"آپ کو وہاں سے کیا ملا؟"

"نمک جو سونے سے زیادہ قیمتی ہے!"

یہ لوگ پرانے سوویت علاقے سے گائڈ کی حیثیت سے ہماری فوج کے ساتھ گئے تھے، اور اب وہ کوپی اور شن ہتھین سے نمک لے کر واپس جارہے تھے۔ اس وقت سوویت علاقے میں نمک کا کال تھا۔

صدر ماؤ نے ان کی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے کہا: "اب تمہیں نمک کے لئے پریشان نہیں ہونا پڑے گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

طلوعِ آفتاب کے وقت ہمیں سڑک پر بے شمار لوگ آتے جاتے دکھائی دیئے، دیواروں پر، درختوں پر اور دیہات میں ہر جگہ بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے، جن میں ہماری فتح کی خبریں لکھی ہوئی تھیں۔ "ہماری فوجوں نے کوپی اور شن ہتھین پر قبضہ کر لیا ہے!" "آیئے اپنی پہلی عظیم فتح کا جشن منائیں۔"

میاؤ علاقے میں

دشمن کی ناکہ بندی کی چوتھی لائن دریائے شیانگ کو توڑنے کے بعد سرخ فوج نومبر ۱۹۳۴ء میں کوانگ شی اور ہونان کی سرحدی شاہراہ پر پہنچ گئی۔ جب ہماری مختصر سی جمعیت وہاں پہنچی تو گہری تاریکی چھا چکی تھی۔ ہم دشمن کے طیاروں سے محفوظ رہنے کے لئے زیادہ تر رات ہی کو مارچ کرتے تھے۔

ہم مارچ کے دوران راستے بھر دشمن سے لڑتے رہے تھے۔ صدر ماؤ کو ایک بار بھی پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اب جیسے ہی ہماری فوج نے آرام کے لئے پڑاؤ ڈالا۔ میں اور میرا ایک ساتھی باڈی گارڈ ژنگ شین چی کھانے کی تلاش میں نکل پڑے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور وہاں کے لوگ بہت مفلوک الحال تھے۔ ہم وہاں سے صرف بارہ تیرہ سیر شکر قند خرید سکے۔ میں انہیں پکا کر صدر ماؤ کے پاس لے آیا۔ وہ ایک چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھے ہوئے، باڈی گارڈوں اور دوسرے ملازمین سے باتیں کر رہے تھے جو ان کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے: "دریائے شیانگ کو عبور کرنا ایک عظیم کامیابی ہے!" یہ حقیقت تھی کہ گزشتہ شب ہمارا دریائے شیانگ کو عبور کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔

ژینگ شن چی اور میں نے اعلان کیا کہ کھانا تیار ہے۔ ہم نے اپنے ہاتھوں میں مٹی کے برتن اٹھائے ہوئے تھے۔ ہم صدر ماؤ کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ کھانا کھا لیں۔ انہوں نے ایک شکر قند اٹھائی اور اُسے کھانا شروع کر دیا۔ پھر انہوں نے کہا۔

"ہم لوگ بہت جلد میاؤ لوگوں کے علاقے میں پہنچنے والے ہیں۔!"

میاؤ علاقہ! یہ ہمارے لئے ایک بالکل نئی بات تھی۔ مجھے یاد تھا کہ ایک بار سیاسی تعلیم کی کلاس میں ایک ٹیچر نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ میاؤ لوگ ایک اقلیتی قومیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ معاشی اور معاشرتی اعتبار سے پس ماندہ ہیں اور یہ کہ ان کی رسوم اور عادات

گاؤں کی سوویت کا

صدر ایک غریب

اور معمولی

انسان تھا

ہم لوگوں سے بالکل مختلف ہیں، اور سفید فوج، ان پر کہیں زیادہ ظلم ڈھاتی ہے۔ لیکن وہ کیسے نظر آتے ہیں، یہ بات ابھی تک پردۂ اسرار میں تھی۔

"وہ ہم، ہان لوگوں کی طرح ہیں،" صدر ماؤ نے ہمیں بتایا "وہ بھی سفید فوج کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف انقلابی تحریک میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ ہمارے اچھے بھائی ہیں۔"

صدر ماؤ نے ہمیں تفصیل سے بتایا کہ میاؤ لوگ کس طرح سفید فوج کے مظالم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ان کی رسوم، عادتوں اور سیاسی عقائد وغیرہ کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ انہوں نے ہمیں تاکید کی کہ ہم میاؤ علاقے میں داخل ہونے کے بعد اپنے اصولوں پر اور بھی زیادہ سختی کے ساتھ کاربند رہیں۔ انہوں نے ہمیں تنبیہ کیا کہ ہم اِدھر اُدھر نہ گھومیں اور جو چیزیں ہماری نہ ہوں ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ انہوں نے بتایا کہ میاؤ عورتیں بھی ہمارے سوویت علاقے کی عورتوں سے مختلف ہیں، جو سرخ فوج کے سپاہیوں کو اپنا بھائی سمجھتی ہیں، بلکہ انہیں اسی نام سے مخاطب بھی کرتی ہیں۔ میاؤ عورتیں اس قسم کے رشتے سے مانوس نہیں تھیں۔ کیونکہ ان پر اب تک جاگیردارانہ خیالات کا اثر تھا۔

صدر ماؤ کی باتیں سن کر ہم الجھن میں پڑ گئے۔ کیا ہم کسی "ممنوعہ خطے" میں جارہے ہیں؟ اپنے خیمے نصب کرنے کے بعد جب ہم کوئی چیز مستعار لینے جائیں گے تو اس کا کیا نتیجہ ہو گا۔ میں نے صدر ماؤ سے پوچھا کہ ان کے سونے کے لئے دروازے (سرخ فوج کے سپاہی لوگوں کے گھروں کے دروازے مستعار لے آتے تھے اور ان ہی پر سویا کرتے تھے۔ صبح اٹھ کر وہ ان دروازوں کو دوبارہ ان کی جگہ لگا دیتے تھے) لانا مناسب ہو گا یا نہیں۔ کیونکہ اگر ہم کہیں شب بسری کے لئے رکتے تھے تو ایسا ہی کرتے تھے۔

"نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہو گا!" انہوں نے بھاری بھرکم لہجے میں جواب دیا۔ پھر انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا: "کیا میں نے تمہیں متنبہ نہیں کیا تھا کہ جو چیزیں تمہاری نہیں ہیں، ان کو ہاتھ نہ لگانا؟"

"پھر آپ کس چیز پر سوئیں گے؟"

"ان کے دروازوں کے علاوہ کسی بھی چیز سے کام چل جائے گا۔"

میں کچھ پریشان سا ہو گیا، لیکن اس کے آگے اور کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ یہ میاؤ لوگ ہم ہان لوگوں سے بہت مختلف ہوں گے اور سخت گیر ہوں گے۔ عین اسی وقت کسی کے خراٹے بھرنے کی آواز سنائی دی۔ یہ جمال ہوانگ ینگ ہو تھا۔ وہ صدر ماؤ کے قریب بیٹھا ہوا سو گیا تھا۔ شکر قند کا باقی حصہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

صدر ماؤ بہت محظوظ ہوئے۔ "ٹھیک ہے،" انہوں نے کہا "پیٹ بھر کھانا کھانے کے بعد ہم سب کو بھی کرنا چاہیے۔ آج رات ہمیں آگے کی طرف مارچ کرنا ہے۔"

ایک سرے سے دوسرے تک مشعلوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا

حالانکہ مجھ پر نیند بری طرح سوار تھی، لیکن پھر بھی میں جاگتا رہا ہوانگ ینگ ہو کے علاوہ باقی دوسرے لوگ بھی جاگ رہے تھے۔ پو پھٹنے کے بعد دشمن کے طیارے موت کا پیغام لئے، غراتے ہوئے بار بار لوگوں کے گھروں پر بم برسانے لگے اور وہاں کے کھیتوں کو اجاڑنے لگے۔

اسی شام کو ہم نے مارچ شروع کر دیا۔ نومبر کی راتیں بہت سرد ہوتی تھیں، اور اس رات چاند بھی نہیں نکلا تھا۔

ہم رات بھر پہاڑوں کے گرد گھومتے رہے۔ ابھی اوپر کی طرف چڑھ رہے ہیں تو اگلے لمحے نیچے، وادی میں اتر رہے ہیں۔ بعض اوقات ہمیں عمودی چٹانوں سے چمٹ کر اوپر چڑھنا پڑتا اور پھر پھسلتے ہوئے نیچے اترنا پڑتا۔ جب ہم کسی چوٹی پر پہنچتے تو معلوم ہوتا کہ آسمان بالکل ہمارے سروں کے اوپر ہے۔ صدر ماؤ چاروں طرف نظر دوڑاتے اور جب انہیں یقین ہو جاتا کہ ہر شخص موجود ہے، تب کہیں جا کر آگے کی طرف قدم بڑھاتے۔

اگلے روز طلوعِ آفتاب کے وقت ہم ایک پہاڑ سے نیچے اتر رہے تھے۔ سامنے ایک چھوٹے سے پہاڑ کے پہلو میں چند عجیب و غریب قسم کے چوبی مکانات نظر آرہے تھے، جنہیں ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ نہ تو ایک منزلہ تھے اور نہ دو منزلہ، بس یوں لگتا تھا جیسے فضا میں بہت سی ٹوکریاں لٹکی ہوئی ہوں۔ صدر ماؤ نے بتایا کہ ہم میاؤ علاقے میں قدم رکھ چکے ہیں۔

جب ہم اس پہاڑی گاؤں میں پہنچے تو سورج افق سے جھانک رہا تھا۔ صبح کا کہر چھٹتا جا رہا تھا اور مکانات زیادہ صاف نظر آرہے تھے۔ ان کی عقبی دیواریں پہاڑی چٹانوں سے بنی ہوئی تھیں اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ ڈھلانوں پر ٹنگے ہوئے ہوں۔ ان کے نیچے بھیڑوں کے باڑے بنے ہوئے تھے۔ پہاڑ کے اوپر سے ایک چھوٹا سا چشمہ بہتا تھا جو کھڑکیوں کے نیچے آتا تو جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے سے تالاب بن جاتے۔

صدر ماؤ جس مکان میں قیام پذیر تھے، اس کی کھڑکیاں ایک بڑے تالاب کی طرف کھلتی تھیں۔ جس میں بڑے سروں والی کارپ مچھلیاں تیرتی پھرتی تھیں۔

"ہمیں صدر ماؤ کے لئے کچھ مچھلیاں پکڑنی چاہئیں!" صدر ماؤ کے ایک دوسرے باڈی گارڈ وو چیہ چنگ نے تجویز پیش کی۔ یقیناً یہ ایک شاندار خیال تھا۔ لیکن ہم اس کی جرأت کیسے کر سکتے تھے جب کہ صدر ماؤ نے صرف ایک دن پہلے اس سلسلے میں ہمیں تاکید کر دی تھی۔

ہم سب خاموش رہے۔

"بہرحال اس مکان کا مالک بھی کوئی مقامی ظالم ہی ہوگا!" وو چیہ چنگ اپنے نکتے پر اصرار کرتا رہا۔

"میرے خیال میں ہمیں پہلے صدر ماؤ سے پوچھ لینا چاہیئے!" ہوانگ ینگ ہو نے آہستہ سے کہا۔

جب میں کچھ پانی لے کر صدر ماؤ کے کمرے میں پہنچا تو وہ آرام کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے بانس کی بنی ہوئی میز پر پانی رکھ دیا اور لمحہ بھر کھڑا سوچتا رہا کہ بات کا آغاز کیسے کروں۔

"جنابِ صدر!" آخر مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی "آپ کو بھوک تو نہیں لگ رہی؟"

"کیا کھانے کیلئے کوئی چیز موجود ہے۔"

"جی ہاں!" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

"کیا ہے؟" صدر ماؤ نے مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے ان کے لئے تھوڑا سا پانی انڈیلا اور اپنے لہجے میں سادگی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "مچھلی، موٹی تازی مچھلی!"

"تمہیں یہ مچھلی ملے گی کہاں سے؟" صدر ماؤ نے پوچھا۔

"بالکل یہیں سے!" میں نے کھڑکی سے باہر تالاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

صدر ماؤ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گئے اور باہر کی طرف دیکھنے لگے

صدر ماؤ دیہی

علاقوں کے معاشی

حالات کا گہری نظر

سے جائزہ لیتے

پھر وہ میری طرف مڑے "کیا تم اتنی جلدی بھول گئے۔ میں نے کل تم لوگوں سے کیا کہا تھا؟" انہوں نے بڑے کڑے لہجے میں کہا۔

میں نے اپنا سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "ہم اس کی قیمت ادا کر دیں گے۔"

"اس سے بھی کام نہیں چلے گا۔"

"ہم صرف چند مچھلیاں خریدیں گے۔" میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

صدر ماؤ میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اقلیتی قومیتوں کے خواص اور ان کے متعلق ہماری پالیسیوں کی وضاحت کرنے لگے۔ "ان کی بھیڑیں اور مچھلیاں کتنی ہی بڑی اور موٹی تازہ کیوں نہ ہوں، تمہیں انہیں ہاتھ تک نہیں لگانا چاہیئے" انہوں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ انہیں اپنے دیوتاؤں کو قربانی کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہوں۔" آخر میں انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں دوسروں کو بھی یہ بتا دوں کہ ان لوگوں کی چیزوں پر دست اندازی نہ کی جائے، یہاں تک کہ انہیں خریدنے کی کوشش بھی نہ کی جائے۔

میں نے کہا "میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔" اور باہر نکل آیا۔

چیہ چنگ باہر بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس لئے میں سیدھا اس کے پاس گیا۔ اس نے فوراً سوال کیا کہ بات بنی یا نہیں

"صدر ماؤ نے اجازت نہیں دی۔" میں نے دو ٹوک جواب دے دیا۔

"ہم قیمت ادا کریں گے!"

"اس کی بھی اجازت نہیں!" میں اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر زور سے چیخا۔ "یہ نظم و ضبط کا معاملہ ہے، سمجھ میں آیا؟" اور میں وہاں سے چل دیا۔

سہ پہر کے وقت تقریباً بارہ آدمیوں کا ایک گروپ وہاں آیا انہوں نے ہان لوگوں کا لباس پہن رکھا تھا اور بندوقیں اٹھا رکھی تھیں۔ وہ صدر ماؤ سے ملنا چاہتے تھے۔

میں نے جلدی جلدی اپنی جیکٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں۔

میری توقع کے برخلاف وہ لوگ بہت شائستہ اور خوش اخلاق تھے۔ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ "ہم مقامی لوگ ہیں!" وہ چیانگ سی کی بولی بول رہا تھا اور اس کے لب و لہجے کو سمجھنا ذرا مشکل تھا۔

مقامی لوگ؟ میں سوچنے لگا، پھر تو یہ میاؤ قومیت سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ وہ صدر ماؤ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں، پھر وہ اپنی بندوقیں بھی ساتھ لائے ہیں؟

"کیا آپ کے پاس کوئی تعارفی چٹھی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں، ہاں!" ایک قد آور شخص نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نکالتے ہوئے جواب دیا۔

میں اسے لے کر صدر ماؤ کے پاس گیا۔ اس وقت وہ ایک نقشے کا جائزہ لے رہے تھے۔ "جنابِ صدر، چند لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں!" میں نے انہیں رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔

"کون لوگ ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

کوپی اور شن تھین پر سُرخ فوج کا قبضہ ہوگیا

"چند مقامی لوگ" میں نے کاغذ کا ٹکڑا ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہ بندوقیں لئے ہوئے ہیں۔"

کاغذ کا مطالعہ کرنے کے بعد صدر ماؤ میری طرف مڑے ان کے چہرے سے بشاشت جھلک رہی تھی۔ "انہیں فوراً یہاں لے آؤ!" پھر وہ خود ہی اپنے مہمانوں سے ملنے کے لئے باہر نکل آئے۔

میں ان اجنبیوں کو صدر ماؤ کے کمرے میں پہنچا کر واپس لوٹ گیا۔ میں کچھ پریشان سا ہوگیا۔ وہ یہاں کس لئے آئے ہیں؟ صدر ماؤ ان سے اس قدر دوست داری سے کیوں پیش آتے ہیں؟

اجنبی لوگ بہت دیر تک صدر ماؤ کے کمرے میں بیٹھے رہے آخر غروبِ آفتاب کے وقت واپس چلے گئے۔

جب میں شام کا کھانا لے کر ان کے کمرے میں داخل ہوا تو صدر ماؤ اب بھی نقشے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ جس پر اب جگہ جگہ سرخ دائروں کا اضافہ ہوچکا تھا۔ "جناب صدر، کھانا کھا لیجئے" میں نے آہستہ سے برتن نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

وہ میری طرف مڑے اور انہوں نے پنسل نیچے رکھ دی۔

"کسی کی مچھلی تو نہیں پکڑ لائے؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"جناب صدر" میں نے پوچھا۔ "یہ کون لوگ تھے؟"

"یہ ہمارے میاؤ کامریڈ ہیں۔" انہوں نے مسرور لہجے میں کہا۔

"کیا میاؤ لوگوں کے پاس بھی بندوقیں ہوتی ہیں؟" میرے تجسس میں اضافہ ہوگیا۔

صدر ماؤ نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ "یہ میاؤ گوریلے ہیں۔ ہمارے کامریڈ!"

"تو کیا میاؤ لوگوں میں بھی ہمارے کامریڈ موجود ہیں؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہمارے کامریڈ اور کمیونسٹ ہر جگہ موجود ہیں!" ان کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ "تم سمجھتے ہو کہ ہم ہی انقلاب کے اجارہ دار ہیں؟" انہوں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

میں مسکرا دیا۔

اس رات ہم نے پھر اپنا سفر شروع کر دیا۔ میں نے وو چینہ چنگ کو رازداری کے انداز میں بتایا۔ "جانتے ہو، میاؤ لوگوں میں ہمارے کامریڈ، کمیونسٹ اور گوریلے موجود ہیں۔"

"واقعی؟" وو کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔

دریائے وو کے کنارے سالِ نو کی آمد

۱۹۳۴ء کا آخری دن تھا، جب ہماری مرکزی انقلابی فوج صوبہ کوئنچو کی کاؤنٹی ہوانگ پھینگ کے قصبے ہوچھانگ میں پہنچیں۔ ہمیں سال کے اختتام تک یہاں قیام کرنا تھا۔

ہوچھانگ ایک ایسا قصبہ تھا جہاں دیہاتیوں کے میلے لگا کرتے تھے۔ یہ ایک بڑی پُررونق منڈی تھی۔ ژوئی چن سے رخصت ہونے کے بعد ہمیں راستے میں اتنا بڑا کوئی قصبہ نہیں ملا تھا۔

وہاں پہنچتے ہی صدر ماؤ فوجی کونسل کے ہیڈ کوارٹر میں ایک میٹنگ میں شامل ہونے کے لئے چلے گئے۔ ہم باڈی گارڈوں کے شیڈول کے مطابق اس دن شینگ شن چی اور راقم الحروف

جو چیزیں تمہاری نہیں ہیں

ان کو ہاتھ نہ لگانا

کی ڈیوٹی پہلی شفٹ میں تھی، اس لئے ہمیں صدر ماؤ کے ساتھ، میٹنگ میں جانا تھا، جب کہ چوہیہ کوئے لِن اور لِن یوژائے کو صدر ماؤ کی رہائش گاہ کا انتظام کرنا تھا۔

سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے چوہیہ میری جگہ آکر ڈیوٹی دینے لگا۔ تاکہ میں جاکر کھانا پکا لوں۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں ذرا جلدی واپس آنے کی کوشش کروں، تاکہ صدر ماؤ کو جلدی گھر لے جاسکوں۔

"کیا تم نے سب انتظامات کر لئے ہیں؟" میں نے پوچھا

"جاکر خود دیکھ لو۔" اُس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے بڑے پُراسرار لہجے میں کہا۔

میں اس جگہ پہنچا جہاں ہماری فوجوں نے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا وہاں کی فضا سابقہ کیمپوں سے بالکل مختلف تھی۔ ہر شخص بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ کچھ سپاہی باریک وردیاں پہنے ہوئے گلیوں سے برف صاف کر رہے تھے، کچھ بستر بچھانے کے لئے دروازے اٹھائے آرہے تھے اور کچھ گیتوں کی مشق کر رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ ہم نئے سال کی رات کا جشن منائیں گے اور شام کو ایک دعوت ہوگی جس میں رنگا رنگ پروگرام پیش کیا جائے گا۔ برف کے گالوں نے ہماری کئی روز کی مسافت کی تھکن دور کر دی۔ میں نے اپنے ساتھی باڈی گارڈ شینگ شن چی کا ہاتھ پکڑا اور اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ "جلدی چل کر دیکھیں کہ کیسا انتظام کیا گیا ہے۔ جب صدر ماؤ یہاں آئیں گے تو ہم نئے سال کا خیر مقدم کرنے کے لئے کچھ تفریح طبع کا سامان کریں گے۔!"

صدر ماؤ کے لئے جس مکان کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس میں پیکنگ کی عمارتوں کا طرزِ تعمیر جھلکتا تھا، چاروں طرف کمرے تھے اور بیچ میں ایک وسیع دالان تھا۔ دروازے کے سامنے برف کے دو مجسمے کھڑے ہوتے تھے۔ دالان کے درمیان اینٹوں کی روش اتنی صاف ستھری تھی، جیسے ابھی ابھی اسے دھویا گیا ہو۔ تین وسیع اور روشن کمرے جن کا رُخ جنوب کی طرف تھا، صدر ماؤ کی رہائش کے لئے تھے اور بیچ والا کمرہ بیٹھک کے لئے مخصوص تھا۔ چھت سے مٹی کے تیل کا ایک لیمپ لٹک رہا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ قدیم طرز کی کم چوڑائی والی لمبی سی چائے کی میز رکھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک چوکور میز تھی، جس کے دونوں طرف بھاری سی آرام کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دروازے کے سامنے والی دیوار پر ہنستے ہوئے بُت کی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ جس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے، جیسے وہ آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ بائیں طرف کا کمرہ صدر ماؤ کی خواب گاہ تھا۔ اس پر ایک نظر ڈالنے سے ہی یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ چوہیہ اور لِن نے اس کو سجانے پر بڑی محنت کی ہے انہوں نے بستر کے نیچے اتنی زیادہ خشک گھاس بچھا دی تھی کہ وہ صوفے کی طرح نرم ہوگیا تھا۔ دائیں طرف کا کمرہ ان کا دفتر تھا۔ دو میزوں کو ملا کر ان سے ایک ڈیسک بنا دی گئی تھی اور اُس پر اسٹیشنری کا سامان اور ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ (باقی آئندہ)



محمد سلیم بھٹی

احمقوں کی جنّت

سرِراہ پڑی لاش کے ارد گرد کافی لوگ اکٹھے ہوگئے تھے۔ لاش کیا تھی۔ اتنے زخم آنے کے باوجود خون کی چند بوندیں نکلی تھیں اور بس جیسے کسی راہ چلتے آدمی نے پتھر مار کر پھینک دیا ہو۔ اوندھے منہ پڑا ہوا ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں لوگ جو ارد گرد کھڑے ہو گئے تھے۔ ابھی ابھی سینما سے باہر نکلے تھے کیونکہ فلم کا انٹرول ہو گیا تھا۔ چند آدمی پہلے ہی لاش کے گرد کھڑے تھے۔ جب سینما سے نکلنے والے لوگوں کی نظر ان پر پڑی تو یہ سب اِدھر آگئے۔

آٹھ دس نوجوان بھی ایک طرف کھڑے تھے بڑے جدید فیشن کے کپڑوں میں ملبوس نئی نسل کے یہ نمائندے ناک اور منہ پر رومال رکھے ہوئے تھے جیسے کوئی مرا ہوا کتّا سرِراہ پڑا ہو۔ ایک کہنے لگا ——— "کمبخت سڑک کے درمیان چل رہا ہو گا کسی کی گاڑی کے نیچے آگیا۔" دوسرا بولا ——— "نہیں یار! یہ تو فٹ پاتھ کے ساتھ ہی پڑا ہوا ہے کوئی ڈرائیور ہی نکمّا تھا شاید پیٔے ہوئے ہوگا۔" تیسرا بولا ——— "چھوڑو یار اس فضول بحث کو، ایسے لوگوں کی موت یونہی ہوتی ہے۔ ابھی کل ہی ایک ایسا آدمی مال روڈ کے چوک کے قریب مرا پڑا تھا۔" چوتھے نے یوں تصدیق کی ——— "ہاں ہاں میں نے بھی دیکھا تھا۔ ارے یار میں تو اسے جانتا بھی تھا، تین دفعہ اس سے جوتے پالش کرائے تھے، بڑی اچھی پالش کرتا تھا مگر یار! تھا ابھی بالکل نوجوان!"

جب زیادہ لوگ اکٹھے ہونے لگے تو نئی تہذیب کے یہ شاہکار چل دیئے۔ لوگ جمع ہوتے گئے۔ مختلف لوگوں کے تاثرات مختلف تھے ——— "ہو گا کوئی لاوارث جس کا ابھی تک کوئی رونے پیٹنے والا نہیں آیا" ایک داڑھی والے آدمی نے کہا اور پھر تمام لوگ خاموش ہو گئے تھوڑی دیر گزری تو ایک دو آدمی آگے بڑھے اور پکڑ کر لاش کو سیدھا کر دیا۔ یہ بھی ایک نوجوان لڑکا تھا۔ سیدھا کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بھی فٹ پاتھ پر جوتے پالش کیا کرتا تھا۔ جیب سے ایک اٹھنّی کھسک کر زمین پر آگری۔ ایک کالا اور ایک سُرخ رنگ کا برش بمعہ دو پالش کی ڈبیوں کے لاش کے نیچے پڑے تھے۔ لڑکے کا چہرہ نیلا اور زرد تھا جیسے مدّت سے بیمار رہا ہو۔ ملیشئے کے کپڑوں کی جیبیں پھٹ گئی تھیں۔ پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ زیادہ تر لوگوں کو تعجب اس بات پہ ہو رہا تھا کہ اس آدمی کا خون کہاں گیا۔ چہرہ اچھا خاصا زخمی تھا۔ سر پہ ایک گہری چوٹ موجود تھی مگر خون بہت تھوڑا نکلا تھا۔

اچانک سینما کے وقفہ کے ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور لوگ اندر چلے گئے۔ لاش کے پاس چند بچے رہ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس کا ایک سپاہی آیا ——— "کمبخت کو مرنے کے لیے بھی سڑک ہی ملی ہے!" سپاہی نے چلتے چلتے کہا کافی دیر گزر گئی۔ شام ہونے کو تھی۔ چند ایک آدمی لاش کے پاس آئے جیبیں وغیرہ دیکھیں اور جب سوائے چند کاغذوں کے کچھ نظر نہ آیا تو چلے گئے۔

اچانک ایک لیڈر صاحب کا وہاں سے گزر ہوا۔ یہ وہی لیڈر تھے جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ کسی غریب کی حالت دیکھ کر اکثر رو دیا کرتے ہیں اور اتنا دردمند دل رکھتے ہیں کہ کیا کہنے۔ ان لیڈر صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ انسانیت دوستی ان کا شعار ہے۔ مگر نہ جانے آج انسانیت دوستی کہاں غائب تھی۔ اپنے چند ساتھیوں سمیت جب لاش کے پاس پہنچے تو نہ جانے کس بات پہ زور کا قہقہہ لگا رہے تھے۔ لاش کو سرسری نظر سے دیکھا ——— "کون ہے یہ؟" اپنے ایک "چمچے" سے دریافت کیا اور پھر "چمچے" نے کہا ——— "جی وہی ہے جو کل ارباب روڈ کے چوک پر فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا تھا اور آپ کے جوتوں پر برش مارنے کو کہا تھا ———!"

"اچھا اچھا ———!" لیڈر صاحب کو یاد آگیا اور پھر ساتھ ہی نفرت سے کہا ——— "کمبخت بڑا اکڑتا تھا کہ پہلے پیسے دو پھر جوتوں پر برش ماروں گا۔" پھر ایک قہقہہ بلند ہوا اور لیڈر صاحب چل پڑے۔

شام ہو گئی تھی۔ انسانوں کا ایک سمندر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آجا رہا تھا۔ ہر طرف روشنیاں ہی روشنیاں تھیں اور روشنیوں کے اس شہر میں جہاں ہر طرف اُجلے کپڑے مگر تاریک اور میلے دل پھر رہے تھے ایک غریب کی بے گور و کفن لاش پڑی تھی مگر کسی کو فرصت نہ تھی کہ ایک نظر دیکھنے کے بعد سوچ ہی لے کہ یہ کون ہے اور کیسے مرا۔ ان لوگوں میں انسانیت کے بڑے بڑے دعویدار بھی تھے سرمایہ دار بھی تھے سیاسی لیڈر بھی تھے عوام دوست بھی تھے غریب پرور بھی تھے، طالب علم بھی تھے مگر کسی کو اس لاش کے متعلق سوچنے کا خیال نہ تھا۔

وقت گزرتا گیا لوگوں کی آمد و رفت میں کمی ہونا شروع ہو گئی۔ سینماؤں میں تیسرے شو کی تیاریاں ہونے لگیں تو سامنے کیفے سے بزرگ لوگوں کی ایک ٹولی نکلی یہ چند ایک بھوک کے ستائے ہوئے ادیب تھے۔ چہروں سے افسوس کی جھلکیاں نمایاں، جسم پر سفید پوشی کا بھرم خطرے میں، جیبیں خالی اور مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے ——— "مرزا صاحب! دیکھیئے کوئی غریب چل بسا۔" ایک صاحب بولے۔

——— "ارے دیکھیں تو یہ کون ہے؟" مرزا صاحب نے کہا اور سب لاش کے قریب آگئے۔ سب آدمی لاش کو دیکھتے ہی ساکت و جامد کھڑے ہو گئے مگر ایک آدمی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ سب کے سب یوں خاموش تھے جیسے خدا کے حضور میں گناہوں کا حساب دے رہے ہوں۔ بڑی دیر کے بعد مرزا صاحب کی آواز آئی

—— —— "دیکھیے صاحب! یہ بھی ہمارے ملک اور ہماری قوم کا چشم و چراغ تھا۔ بھلا اس کی جان اتنی ہی بے کار تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اپنا ملک جنت ہوتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ "ایسی جنت کو کیا کرے کوئی!" تف ہے ایسے معاشرے پر اور انسان دوست گندم نما جَو فروشوں پر! کیا یہ کسی قوم کی انتہائی پستی کی دلیل نہیں کہ اتنی دنیا گزر گئی کسی کو احساس تک نہ ہوا کہ معلوم کرتا کہ یہ انسان کون ہے؟ کسی کو اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اسے بیچ سڑک سے اٹھا کر کسی دکان کے اونچے تختے پر لٹا دیتا کوئی بھی اس کے قاتل کو پکڑنے کی کوشش نہیں کرے گا، اس لیے کہ یہ غریب تھا۔" مرزا صاحب خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد صدیقی صاحب نے بولنا شروع کیا صدیقی صاحب جو اب تک رو رہے تھے —— "مرزا صاحب آپ بھی تو بڑے بھولے آدمی ہیں، اس شخص کے متعلق مت پوچھیں کہ اس سے یہ سلوک کیوں روا رکھا گیا۔ یہ پوچھیں کہ کتنا عظیم انسان تھا یہ! کتنا عظیم انسان آج مر گیا۔ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ بچہ تھا، اس کا باپ اسکول میں پڑھاتا تھا اور اس کی ماں محلّے کے بچوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ یہ لڑکا بی لے پاس تھا اور قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے یہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لوگوں کے جوتے پالش کیا کرتا تھا۔ جبکہ اس سے کم تعلیم یافتہ، اس سے کم قابلیت کے لوگ اہلِ زر اور اہلِ سفارش ہمارے ملک کی قسمت کے فیصلے کرتے ہیں۔" صدیقی صاحب بولتے بولتے لڑکے پر جھک گئے۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑے غور سے دیکھنے لگے —— "دیکھیے صاحب! یہ ہاتھ بھلا کسی عظیم انسان کے ہاتھ نہیں؟ یہ ہاتھ اس انسان کے ہاتھ ہیں جو دن کو فٹ پاتھ سے چند سکّے کماتا اور رات کو ماں کے قدموں میں جنت تلاش کرتا تھا۔ یہ اس انسان کے ہاتھ ہیں جس نے زندگی میں بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے مگر اس کے اپنے ہاں ہمیشہ نشیب ہی نشیب رہے فراز کبھی نصیب نہ ہوا۔ یہ وہ درد کا مارا ہے جس نے اپنی زندگی اپنی ماں کی خدمت اور بہن کی تعلیم کے لیے وقف کر دی۔ یہ میرا پڑوسی فیض ہے مگر دنیا کو فیض کی یہ ادا بھی پسند نہ آئی۔"

صدیقی صاحب بولتے رہے اور ہاتھ سے فیض کی جیب سے چند کاغذ نکالے۔ یہ پہلا کاغذ کسی رسالے کا تھا شعر لکھا تھا ؎

معاشرہ تو نہیں احمقوں کی جنّت ہے
وہ بود و باش جہاں عزتِ عوام نہیں

دوسرا کاغذ ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ کسی شاعر کے اشعار نقل کیے گئے تھے۔ ؎

نام تقدیر کا لیتے ہیں یہ عیار بہت
آسمانوں سے انہیں مالِ حرام آیا ہے
ان امیروں کو کوئی حق نہیں اترانے کا
ان کمینوں نے غریبوں کا نمک کھایا ہے

تیسرا کاغذ کھولا۔ یہ ایک دن پہلے کی ڈائری تھی لکھا تھا —— "ماں کی بیماری بڑھتی جا رہی ہے اور میری آمدنی گھٹتی جا رہی ہے۔ بہن بیچاری بھی الگ میری غربت سے تنگ ہے۔ میں کتنا نکمّا آدمی ہوں کہ دو وقت کی روٹی بھی میسّر نہیں۔ میری ماں کو جس نے مجھے اتنی تعلیم دلوائی تھی میری تعلیم کا کیا فائدہ ہوا۔ آج دوپہر ہم سب کا فاقہ تھا اس لیے کہ ماں کی دوائی پر پورے آٹھ آنے خرچ ہو گئے۔ اب بھی پورے دن کی کمائی سے صرف دو روٹیاں خرید سکا ہوں ان سے کس کس کا پیٹ بھرے گا۔ میرا، میری بہن کا یا میری ماں کا؟"

ڈائری اس جگہ ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ایک اخبار کا تراشا تھا جس پر اس لیڈر کی چند دن پہلے کی تقریر تھی جو فیض کی لاش کے قریب سے شام کو قہقہے لگاتا گزرا تھا:

"میرے غریب بھائیو! میں تمہارا کتنا شکر گزار ہوں، یہ مت پوچھو۔ تم نے مجھے بہت بڑے رتبے پر پہنچایا ہے مجھے سب معلوم ہے۔ میں شروع ہی سے تمہاری خدمت کرتا آیا ہوں اور اب بھی میری جان و مال تمہاری خدمت کے لیے وقف ہے۔ مجھے قسم ہے اپنی اولاد کی میں کسی انسان کو بھوکا نہیں مرنے دوں گا۔ میرا آپ سے یہ وعدہ ہے کہ ہر آدمی کو باعزت روٹی ملے گی مگر اس کے لیے آپ کو تھوڑا صبر کرنا ہوگا اور اس کے لیے آپ کو پرسکون فضا پیدا کرنا ہوگی تاکہ ہم آپ کی بہتری کے لیے جو سکیمیں بنائے ہوتے ہیں ان کو پورا کر سکیں۔"

"دیکھا مرزا صاحب! لوگ بھوکے مر رہے ہیں اور لیڈر صبر کی تلقین کر رہے ہیں۔" صدیقی صاحب

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں



’ہم انقلاب کی تیاری میں مصروف ہیں‘

بھاشانی کا اعلان

آغا مسعود حسین

حالات کی پستی نے انسان کو یہاں تک گرا دیا ہے کہ ایک ہی جگہ پر لوگ کتے کی طرح مر رہے ہیں اور دوسرے ان کو دیکھ کر گذر جاتے ہیں ——" یہ ایک مغربی مبصر کا کہنا ہے جس نے حال ہی میں بنگلہ دیش کا دورہ کیا ہے اس نے جگہ جگہ ایسے مناظر دیکھے ہیں کہ شاید کتابوں میں ماضی میں کئے جانے والے مظالم کی داستانیں ان کے سامنے خاموش ہو جائیں ہر جگہ موت کے سائے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ ہے۔ قتل و غارت ہے اور بدعنوان زندگی کا شکار بن گیا ہے —— ان سب چیزوں کے دھانے۔ ایک نیا انقلاب بنگلہ دیش میں آ رہا ہے جہاں موجودہ سیاسی قیادت خس و خشاک کی طرح اڑ جائے گی اور شاید یہی وہ سیاسی حالات ہیں جن پر پردہ ڈالنے کے لئے شیخ صاحب پاکستان کے جنگی قیدیوں پر مقدمہ چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

دراصل جنگی قیدیوں پر مقدمہ چلانے کی تجویز سب سے پہلے تاج الدین نے شیخ مجیب کو دی اور جو ہندوستان کے اشارے پر دی گئی تھی۔ تاج الدین کو فوراً ہی اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ "بنگلہ دیش اپنی اس شکل میں ایک سال بھی نہیں رہ سکتا"، کیونکہ جس جلدی اور نفرت کی بنیاد پر اس کا عمل آیا تھا، اب وہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ مغربی پاکستان نفرت کی علامت بنکر ہر بنگالی کے دل میں پیوست ہو گیا تھا اور اس نفرت نے چھ نکات کی بنیاد پر اپنا بھرپور اظہار کیا اس نفرت نے انہیں ہندوستان کے قریب پہنچا دیا اور ہندوستان نے ان انتہا پسند بنگالیوں کے ساتھ مل کر ان ہی کی آزادی ختم کر دی اور جب ہندوستان نواز بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آ گیا تو وہاں صرف بربادی تھی۔ اقتصادی ویرانی تھی اور ہندوستان مارواڑیوں کی لوٹ کھسوٹ بنا۔ اس دہشت ناک منظر کے علاوہ وہ انسان تھے جنہیں محسن وطن کی محبت کی پاداش میں سرنگوں سربازار ذبح کیا جا رہا ہے اور دیکھتے دیکھتے لاکھوں کی آبادی خاک کا پیوند ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اب بنگالی کیا کریں؟ وہ ان نعروں کو کیسے روکیں جو اب پاکستان کی حمایت میں بنگلہ دیش کے طول و عرض میں پھیل رہے ہیں۔ تاج الدین کی عیارانہ نگاہیں اب آنے والی تبدیلی کو بھانپ چکی تھیں اور انہوں نے اس سے توجہ ہٹانے کے لئے جنگی مجرموں پر مقدمہ چلانے کی تجویز پیش کی جسے شیخ صاحب منظور کر کے بہت جلد عملی جامہ پہنانے والے ہیں۔

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس مقدمہ سے کون کنونشن متاثر ہو گا۔ اور کون رسوا ہو گا۔ ہمیں تو صرف اسباب سے مطلب ہے کہ کیا بنگلہ دیش کی حکومت ان بیگناہ فوجیوں پر مقدمہ چلا کر بنگلہ دیش کے عوام کو آنے والی تباہی سے بچا سکے گی؟ کیونکہ ایک طرف بنگلہ دیش کے عوام کا مطالبہ بڑھتا جا رہا ہے کہ "ہمیں پاکستان واپس دو، ہندو استحصالیوں سے بچاؤ، ہمیں روٹی دو۔" یہ نعرے اب اتنی حقیقت بن گئے ہیں کہ شیخ صاحب کے سامنے صرف سیاسی اندھیرا ہے اور اگر کہیں روشنی کی کرن نظر آتی ہے تو وہ ہندوستان ہے جس نے انہیں ان کی دو سو سالہ تاریخ سے محروم کر دیا ہے۔

جنگی قیدیوں پر مقدمہ چلانے کی تجویز بھارت کے اشارے پر دی گئی



اب شیخ صاحب کو تاج الدین کی یہ تجویز پسند آئی ہے کہ ان فوجیوں پر مقدمہ چلا کر وہ اپنے عوام کو مصروف رکھیں گے اور بہت دنوں تک پاکستانی فوجیوں کے ظلم کی داستان انہیں بنگلہ دیش کے خلاف نعرے لگانے سے روکے رکھے گی۔ لیکن بی بی سی کے ٹیلی ویژن کے نمائندے نے لکھا ہے کہ یہ کب تک؟ ایک طرف بنگلہ دیش میں انقلاب پرست قوتیں تیزی سے اپنے منشور پر عمل پیرا ہیں اور وہ ہر گذرتے دن کے ساتھ ان میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے دوسری بہاریوں کی قابلِ رحم حالت ہے۔ ایلین ہارٹ کا کہنا ہے کہ میں نے ویت نام، نائجیریا بیافرا میں اتنے سنگین ظلم نہیں دیکھے۔ جتنا بنگلہ دیش میں ان بہاریوں پر پاکستان کی حمایت پر توڑا جا رہا ہے اس کا کہنا ہے کہ یہ حقیقت کتنی متضاد ہے کہ بنگلہ دیش کے عوام کو اس مقدمے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ اپنے اوپر ہندو مارواڑیوں کے ہاتھوں ہونے والے ظلم کو بھول گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستان کے حق میں نعرے لگا رہے ہیں۔

لیکن ہم ایلین ہارٹ کی باتوں پر کیوں توجہ دے سکتے جبکہ آج ہونے والے ظلم میں ان کا نوآبادکار کے ایجنٹوں کی حیثیت سے بہت بڑا کردار ہے۔ لیکن ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ شیخ صاحب ان جنگی قیدیوں پر مقدمہ چلا کر اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ کل کا مشرقی پاکستان آج کا بنگلہ دیش، مستقبل میں کیا ہو گا۔ اس کا جواب بھاشانی نے دیا ہے کہ "ہم جس انقلاب کی تعمیر کر رہے ہیں وہ اب شروع ہو رہا ہے۔ ہمیں پاکستان کے جنگی قیدیوں سے کوئی مطلب نہیں ان کا اب سرزمین سے تعلق ختم ہو چکا ہے۔ یہ ہندوستان کا مسئلہ ہے ہم تو انقلاب کی تیاری میں مصروف ہیں ——"

جاسوس بنام افسر شاہی

یہ نظم بھارتی ہوائی جہاز "گنگا" سے متعلق کیس کے وعدہ معاف گواہ ڈاکٹر فاروق حیدر نے دوران اسیری کوٹ لکھپت جیل لاہور، میں لکھی۔ نظم اُن کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ انہوں نے یہ نظم، ۲۹، مارچ ۱۹۷۲ء کو ایک خط کے ساتھ اپنے قریبی رشتہ دار جناب عابد حسین منٹو کو جو اس کیس میں صفائی کے وکیل بھی ہیں۔ بھیج دی

فاروق حیدر

ہم کفر کو مٹائیں تو جاسوس ہیں
جان پر کھیل جائیں تو جاسوس ہیں

تم پیالے بھرو تو محبِ وطن
خون ہم جو بہائیں تو جاسوس ہیں

تم گھروں کو بھرو تو محبِ وطن
ہم گھروں کو لٹائیں تو جاسوس ہیں

تم لہو جو پیو تو محبِ وطن
ہم جو نعرہ لگائیں تو جاسوس ہیں

تم محبِ وطن تاشقند میں بنو
ہم جو "گنگا" اڑائیں تو جاسوس ہیں

تم جو عدو سے پٹو تو محبِ وطن
ہم عدو کو مٹائیں تو جاسوس ہیں

تم جو ناچو برہنہ تو ناچو کہ ہم
دار پر جھول جائیں تو جاسوس ہیں

جس سپر کو توتی کے پرے ڈال دو
وہ اگر ہم اٹھائیں تو جاسوس ہیں

جس گہر کو سمندر میں تم پھینک دو
ہم اگر ڈھونڈ لائیں تو جاسوس ہیں

جس اجل سے تم آنکھیں چراتے رہے
اُس سے آنکھیں ملائیں تو جاسوس ہیں

جس کو چھو کے سبھی سرخرو ہو گئے
اُس کو ہم جو اٹھائیں تو جاسوس ہیں

تم جو پدما جلاؤ تو بالکل صحیح!
ہم جو "گنگا" جلائیں تو جاسوس ہیں



پشاور میں چند افراد پر مشتمل

ایک ٹولی کا نام پیپلز پارٹی ہے

آغا علی سعید - رکن پیپلز پارٹی - بازار کلاں - پشاور

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اقتصادی ناہمواری دور کرنے، مساوات اور سوشلزم لانے کا نعرہ بلند کیا اور اس نعرہ کے بطن سے پاکستان پیپلز پارٹی وجود میں آئی۔ پاکستان کے ہر گوشے میں ایک نئی امنگ اور جذبے کی لہر دوڑ گئی۔ پاکستان کے بے کس اور مجبور عوام نے جناب بھٹو کو اپنا تن من دھن پیش کر دیا اور اپنے محبوب رہنما کی رہنمائی میں ایوب آمریت کو دفن کر کے رکھ دیا۔ الیکشن ہوئے اور ایک بار پھر پاکستان کے مردوں اور عورتوں نے جناب بھٹو کی دل و جان سے بھرپور حمایت کی اور اس کے نتیجے میں پارٹی عوامی امنگوں کے جلو میں پوری قوت کے ساتھ ابھری اور بالآخر پارٹی برسرِ اقتدار آگئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پارٹی کے چھپے رستموں نے اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیئے اور کم از کم پشاور شہر کی حد تک تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ پشاور میں اقتدار پر آتے ہی پارٹی نے پوری رفتار سے تنزل کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا اور آج یہ عالم ہے کہ پشاور میں پاکستان پیپلز پارٹی انتہائی کسمپرسی اور نزع کی حالت میں ہے۔ اور جس کا بڑا اور روشن ثبوت پشاور میں پولیس ہڑتال کے دوران پارٹی کی مظلومی اور بے کسی کی شکل میں سب کے سامنے ہے۔

ہائے کیا سہانے دن تھے الیکشن کے! جب پشاور کے یہ خداوند مجسمِ انکسار و عاجزی بنے کارکنوں کے گھروں ان کی دکانوں اور ان کی "تنگ و تاریک گلیوں" کوچوں کو اپنے چہرہ ہائے پُرانوار سے روشن رکھتے تھے اور وہاں جانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اِن دنوں پاکستان پیپلز پارٹی پشاور کے ذرّے ذرّے میں سمائی ہوئی تھی اور آج چند "قابل اور سمجھدار" افراد پر مشتمل ایک ٹولی کا نام "پاکستان پیپلز پارٹی پشاور" ہے اور اسی ٹولی کو عجائب گھر کے نادرِ روزگار مجسموں کی طرح ہر نمائش گاہ میں سجا دیا جاتا ہے۔!

عام کارکنوں کے ساتھ خداوندانِ پارٹی کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ پارٹی انتشار اور پراگندگی کا شکار ہے اور پارٹی کے کارکنوں پر مایوسی اور یاسیّت چھائی ہوئی ہے۔ اگر یہی حالت قائم رہی اور رہنماؤں کی خدائی کا بت توڑا نہ گیا اور پارٹی کی قیادت میں بنیادی انقلابی تبدیلیاں نہ لائی گئیں تو سرحد میں پاکستان پیپلز پارٹی علامہ اقبال کے اس مصرعہ کی تفسیر بن کر رہ جائے گی کہ ؎

"تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں!"

جہاں تک جناب بھٹو کی ذات کا تعلق ہے تو وہ اب بھی عوام کی امنگوں کے مرکز اور امیدوں اور آرزوؤں کی آخری منزل ہیں۔ اب بھی عوام ان کی ایک آواز پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہیں لیکن اگر ہر سطح پر قیادت کو مخلص اور دیانت دار نہ بنایا گیا اور ان رہنماؤں کی نوکر شاہی ذہنیت کا سدِّباب نہ کیا گیا تو یہ یاد رہے کہ ان ساری باتوں کا بوجھ جناب بھٹو کی ذات پر پڑے گا۔ اور ان کے حساب میں لکھا جائے گا اور یہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک ادنیٰ کارکن کے لیے بھی قابلِ قبول نہیں۔

گزشتہ ۲۱ اپریل کو جناب صدر کی حلفِ وفاداری اٹھانے کی تقریب میں شمولیت کرنا تھی۔ اس سلسلے میں ریجنل آفس سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ ریجنل آفس میں اپنا نام لکھوا دیں اور ساتھ دس روپے جمع کرا دیں صبح آپ کو پنڈی پہنچا دیا جائے گا اور کارڈز برائے داخلہ بھی مل جائیں گے۔ اور ان سارے لوگوں کی قیادت کریں گے جناب امان اللہ خان ڈی۔ آئی۔ جی ٹریفک! یہ سن کر میں نے مسٹر سعید احمد جنرل سیکرٹری وارڈ توسیعِ شہر اور مسٹر عبدالرؤف جنرل سیکرٹری وارڈ چوک ناصر خان نے انکار کر دیا۔ کیونکہ ہمیں ڈی آئی جی صاحب کی قیادت منظور نہ تھی۔

اب رہا آپ کا سوالنامہ... تو عرض ہے کہ

(۱) پشاور میں پاکستان پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آنے کے بعد ماضی کی نوکر شاہی سے بڑھ کر ثابت ہوئی ہے۔

(۲) ہمیں تو پشاور میں موجودہ قیادت کے ہاتھوں پارٹی کی کسی بھلائی اور ترقی کے امکانات کی ہرگز کوئی توقع نہیں ہے۔

(۳) دو چیزوں کے درمیان رابطہ یا خلاء کے سوال پر اس وقت غور ہو سکتا ہے جب دو چیزوں کے بالمقابل وجود بھی قائم ہو لیکن جب کہ پارٹی کے رہنما سایہ ہی کی طرح عنقا ہیں تو رابطہ یا خلاء کے متعلق ہم کیا عرض کر سکتے ہیں ——!

(۴) سرکاری عہدوں پر جانے والے رہنما تو ہمارے لیے خدا بن کر رہ گئے ہیں۔

(۵) کارکنوں میں اتحاد و تنظیم اور عوامی انقلابی سپرٹ پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے تو پشاور کی موجودہ قیادت یکسر تبدیل کر دی جائے اور خصوصیت کے ساتھ جن لوگوں کے پاس سرکاری عہدے ہیں وہ پارٹی کے عہدوں سے فوراً دست بردار ہو جائیں۔ پارٹی کے مرکزی دفاتر اور شہر کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے وارڈز کے دفاتر باقاعدگی سے کھلنے چاہییں اور صرف کھلنے ہی نہیں بلکہ ان میں باقاعدہ کام بھی کیا جائے۔ پارٹی کے رہنما وقتاً فوقتاً ان دفاتر میں جائیں، کارکنوں سے ملیں اور ان کی وساطت

سے عوام کی مشکلات اور مسائل سے باخبر ہوں اور ان کا حل تلاش کیا جائے۔ کارکنوں کو باقاعدہ سوشلسٹ ادب کی تعلیم دی جائے۔

(۶) اکثر و بیشتر ایسی باتیں سننے میں آئی ہیں کہ پارٹی کے مختلف افراد نے مختلف ذرائع سے ذاتی مفاد حاصل کئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس پر ٹھوس تحقیقات کی جائے تو بہت انکشافات ہو سکتے ہیں۔

(۷) میرے خیال میں تو پارٹی ہی کو بالادستی حاصل ہونی چاہیئے اور پارٹی کی قیادت ایسے بے لوث اور بے غرض ہاتھوں میں ہو کہ وہ ہر وقت ایک بھرپور، صاف ستھری، صحت مند اور تعمیری تنقید کر کے حکومت کو غلطیوں سے بچائے رکھے۔

(۸) جہاں تک عام کارکنوں کا تعلق ہے یہ الزام غلط ہے۔ کسی کارکن کو اتنی ذمہ داری ہی نہیں سونپی گئی ہے کہ وہ حکومت کے کام میں مداخلت کر سکے۔ ایک کارکن کی صحیح اور جائز شکایت پر کان نہیں دھرا جاتا تو وہ حکومت کے کسی شعبہ میں کس طرح مداخلت کر سکتا ہے

اوپری نامزدگیوں نے پیپلز پارٹی کو تباہ کر دیا

جاوید نجمی پبلسٹی سیکرٹری پیپلز پارٹی ملیر کھوکھرا پار کراچی



۱ - پاکستان پیپلز پارٹی کے برسراقتدار آنے کے بعد سے لوگ بلاتخصیص پارٹی میں شمولیت اختیار کرتے اور کر رہے ہیں۔ اس طرح ان لوگوں کی شمولیت سے جو پارٹی کے اصولوں کے مخالف تھے انہوں نے پارٹی کی صحیح راہ عمل کو تبدیل کر دیا اس کے علاوہ پارٹی میں نئے اور پرانے مفاد پرست کارکنوں نے پارٹی کی تنظیم کی دھجیاں بکھیر دیں اس وقت پارٹی نظم و ضبط اور تنظیم کے لحاظ سے دوسری سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں انتہائی بدتر ہے اس کی سب سے بڑی وجہ اوپری سطح سے ہونے والی نامزدگیاں ہیں۔

۲ - عوامی حکومت کے دور میں عوامی توقعات کا پورا ہونا مشکل نظر آتا ہے اگر حکومت اپنے اصولوں اور نعروں کو پیش نظر رکھ کر کام کرے تو یہ توقعات پوری ہو سکتیں ہیں صرف اعلانیہ اور کاغذی طور پر اصلاحات کا چرچا عام ہے اور کیا معلوم ان اصلاحات پر عملدرآمد کب ہوگا ویسے بھی اصلاحات مزدور، کسان مفاد کے منافی تیار کی گئیں ہیں اور مزدور مفاد کے لئے ان میں تھوڑی سی بھی لچک باقی نہیں رہی ان اصلاحات سے سیٹھوں، وڈیروں اور بڑے بڑے جاگیرداروں کو فائدہ پہنچے گا۔ البتہ یہ چھوٹے جاگیرداروں اور ہاریوں کو لڑانے کا ایک اچھا حربہ ہے۔ چونکہ دوسرے پسماندہ ممالک کی طرح پاکستان بھی نیم نوآبادیاتی اور نیم جاگیردارانہ معیشت میں مبتلا ہے لہٰذا حکومت اس بوسیدہ معیشت کو مختلف پیوند لگا کر پروان چڑھانا چاہتی ہے۔ سامراجی ممالک کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ اس معیشت کا ڈھانچہ قائم رہے تاکہ ان کی لوٹ کھسوٹ جاری رہ سکے ملک کے رجعت پسند طبقے کا مفاد بھی اسی میں ہے تاکہ ان کا جاگیردارانہ استبداد عوام پر قائم رہ سکے۔ ان حالات میں حکومت جو "سوشلزم ہماری معیشت ہے" کے نعروں پر قائم ہوئی ہے "ملی جلی معیشت" کی بات کیوں کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں ابھی تک وہی افسر شاہانہ اور جاگیردارانہ نظام قائم ہے طبقاتی شعور رکھنے والے کارکنوں کے علاوہ حکومت کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ بھی اس نظام کو ختم کرنے میں ان کے ساتھ بھرپور تعاون کرے

۳ - پارٹی کے کارکنوں، عوام اور پارٹی کی قیادت کے درمیان اتنا زبردست خلاء ہو گیا ہے کہ اگر پارٹی کے کارکن اور قیادت صحیح اصولوں کو پیش نظر رکھ کر مسلسل اور تعمیری

پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن "الفتح" کے لئے لکھیں

پاکستان پیپلز پارٹی اپنے کارکنوں اور عوام کے تعاون سے برسراقتدار آگئی ہے۔ اقتدار کے حصول کے بعد اس کے کارکنوں کا کیا کردار ہے۔ ان کے اور ان کے رہنماؤں کے درمیان کیا رابطہ ہے۔ یہ سب کچھ کارکنوں کی زبانی جاننے کے لئے ہم یہ سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے کارکن منظم اور مضبوط ہو کر وطن دشمنوں پارٹی دشمنوں اور پارٹی کے منشور سے غداری کرنیوالوں کا مقابلہ کر سکیں۔ تمام کارکنوں سے درخواست ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہم سے تعاون کریں نیچے کچھ سوالات دیئے گئے ہیں۔ کارکن ان کے جواب ہمیں تفصیلاً لکھ کر بھیجیں۔ اس کے ساتھ اپنی (۱) تصویر (۲) کارڈ نمبر، (۳) پارٹی یونٹ اور (۴) یونٹ بھی لکھ کر بھیجیں۔ سوالات یہ ہیں۔

(۱) پیپلز پارٹی کے برسراقتدار آنے کے بعد آپ کا پارٹی کے کردار کے بارے میں پہلا تاثر کیا ہے؟

(۲) عوام نے پیپلز پارٹی سے جو توقعات وابستہ کی تھیں، ان کے پورے ہونے کے کیا امکانات ہیں

(۳) پیپلز پارٹی کی قیادت اور کارکنوں کے درمیان کوئی ربط باقی ہے یا خلاء پیدا ہو گیا ہے۔

(۴) سرکاری عہدوں پر جانے والے رہنماؤں کا کارکنوں سے کیا رویہ ہے۔

(۵) کارکنوں کے اتحاد اور تنظیم کے لئے آپ کے ذہن میں کیا تجاویز ہے۔

(۶) پیپلز پارٹی کے بااثر افراد نے مختلف ذرائع سے کمائی شروع کر دی ہے۔ کیا آپ کے علاقے میں بھی اس قسم کے واقعات ہوئے ہیں۔

(۷) آپ کے خیال میں حکومت کو پارٹی پر کنٹرول کرنا چاہیئے یا پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے۔

(۸) عام تاثر یہ ہے کہ آپ لوگ پولیس، نوکر شاہی اور عدلیہ کے کاموں میں مداخلت کر رہے ہیں یہ کہاں تک درست ہے۔؟

جدوجہد کریں تب بھی اس کو پُر کرنے کے لئے ایک عرصہ درکار ہوگا۔ طبقاتی جدوجہد کے لئے ضروری ہے کہ قیادت محنت کش عوام کے طبقے ہیں سے ہو۔ پارٹی کی بیشتر قیادتیں نامزدگیوں کی صورت ہیں ہوئی ہیں اور یہ قیادتیں ہمیشہ امیر طبقے سے غریب طبقے پر مسلط کی گئی ہیں اور دوسرے طبقے کی قیادت میں غریب طبقے کا کام کرنا چہ معنی دارد؟ اگر تھوڑی بہت قیادت نچلے طبقے سے لی بھی گئی تو ان کے کردار کو گندہ کرنے کے لئے انہیں وزارتوں کی پیش کش کر دی گئی۔ تاکہ وہ عوامی طبقے سے علیحدہ رہ کر ان کو صحیح شعور نہ دے سکیں۔

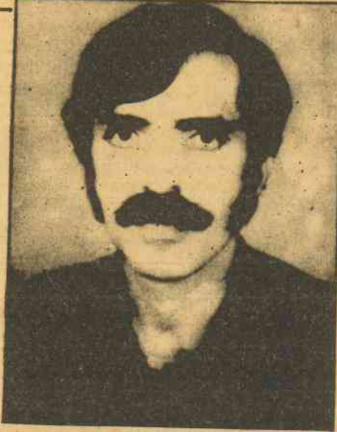
۴ ۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے امیدوار جس خلوص اور ہمدردی سے اپنے کارکنوں اور عوام کے ساتھ پیش آیا کرتے تھے آج اس خلوص اور ہمدردی کا فقدان ہے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگ اپنے عمل سے کچھ ایسا ظاہر کرتے ہیں جیسے ان کا تعلق کبھی عوام سے تھا ہی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ نے ان کو اعلیٰ عہدوں کے لئے پیدا کیا تھا۔ اگر کچھ وزیر وغیرہ عوام کو تھوڑی بہت عزت دے کر شکایت سننے کا موقع فراہم کرتے ہیں تو وہ ان کے مسائل کو حل کرنے کے بجائے ان کو گول مول جواب دے کر چلتا کر دیتے ہیں۔

۵ ۔ کارکنوں میں اتحاد اور تنظیم صرف اسی صورت ہو سکتی ہے کہ پاکستان کی بنیاد پر پارٹی کے کارکنوں اور عہدیداروں کا ایک کنونشن بلایا جائے اور ایک منظم تنظیم بنائی جائے جس کو زیادہ سے زیادہ اختیارات ہوں اور اس میں کسی قسم کی نامزدگی نہ کی جائے بلکہ کارکنوں کو حق دیا جائے کہ وہ صحیح فیصلہ کر کے اپنے عہدیداروں کا چناؤ کریں۔ کنونشن میں سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور ان کے ایجنٹوں کو ہرگز ہرگز شامل نہ کیا جائے۔

۶ ۔ ہمارے علاقے میں چند خود غرض، موقع پرست کارکن اب تنظیم کے خود ساختہ صدر اور جنرل سیکرٹری بن بیٹھے ہیں اور حکومت کے مختلف اداروں میں جا کر رعب ڈالتے اور غریبوں کو پریشان کرتے ہیں اس کے علاوہ لوگوں کے مسائل حل کرانے کے سلسلے میں ان سے بڑی رقمیں وصول کرتے ہیں غریب مزدوروں کے خون پسینے کی کمائی سے ٹیکسیوں میں گھومتے ہیں اور عیش کرتے ہیں اس کے علاوہ انہوں نے دستخطوں اور مہروں کا جگہ بہ جگہ استعمال شروع کر رکھا ہے لوگوں کے ناجائز کام کرانے کے لئے غیر قانونی طریقے استعمال کرتے ہیں کسی کو پلاٹ الاٹ کرانے کا وعدہ کہیں پراپرٹی ٹیکس کی معافی کا اعلان اور کہیں غریبوں کو دھمکیوں سے مرعوب کرتے نظر ہیں۔

۷ ۔ میرے خیال میں پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے کیونکہ اگر حکومت پارٹی پر کنٹرول کرے گی تو پارٹی صحیح طور پر کام کر سکے گی اور نہ حکومت۔ اس طرح حکومت اور پارٹی میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا اور جمہوریت بھی قائم نہ ہو سکے گی حکومت کو مزید پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر پارٹی حکومت پر کنٹرول کرے گی تو اس طرح حکومت عوام اور پارٹی کے کارکنوں کے درمیان اتحاد برقرار رہے گا اور حکومت کے لئے ایک خوشگوار فضا پیدا ہوگی۔

۸ ۔ یہ غلط تاثر ہے کہ ہم لوگ پولیس، نوکر شاہی اور عدلیہ کے کارناموں میں مداخلت کر رہے ہیں کیونکہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری بے جا مداخلت سے حکومت کو کسی طرح کا نقصان پہنچے بلکہ یہ تاثر بدعنوان اور نوکر شاہی کے ایجنٹ دے رہے ہیں۔ تاکہ حکومت ملک کے اندرونی مسائل میں الجھ کر صحیح کام نہ کر سکے اور یہ دوسری سیاسی جماعتوں کی الزام تراشی ہے جو ہماری پارٹی کو خوشحال اور منظم نہیں دیکھنا چاہتی



سرمایہ داروں کے طفیلی بھلا عوام کو کیا فائدہ پہنچائیں گے

غلام مصطفےٰ بلوچ - پنوعاقل

۱ ۔ جب تک پارٹی اپنی صفوں میں گھسے ہوئے وڈیروں اور سرمایہ داروں کی طفیلی بنی رہے گی اقتدار ہو یا نہ ہو عوام کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا:

۲ ۔ فی الحال کسی قسم کی توقعات کا پورا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔

۳ ۔ ربط یا خلا رسے بھی موزوں لفظ ہے "انتہائی وسیع خلیج" ۔ جسے عبور کرنے کے لئے وقت چاہیئے۔

۴ ۔ وہ رہنما جواب سرکاری عہدیدار ہیں یا با اثر ہیں انتہائی آمرانہ کردار پیش کر رہے ہیں۔ اور کارکنوں سے ان کا رویہ انتہائی توہین آمیز ہے (چند ماہ ہوئے ایک وزیر باتدبیر نے جو پہلے کارکنوں کے لئے اپنی جان قربان کرتے تھے۔ سینکڑوں لوگوں کے سامنے صرف خود ساختہ کارکنوں کی خوشنودی کے لئے اپنے کارکنوں سے توہین آمیز سلوک کیا)

۵ ۔ ۲۰ دسمبر کے بعد پارٹی میں آنے والے ہر آدمی کو پارٹی سے خارج کر دیا جائے۔ ضلعی سطح سے نمائندے کر مرکزی طور پر تنظیم نو کی جائے پارٹی کے ہر رکن کی تمام ملکیت کے مالکانہ حقوق پارٹی کو دے دیئے جائیں تاکہ وڈیروں اور سرمایہ داروں کا فراڈ کھل سکے۔

۶ ۔ جی ہاں۔ یہ واقعی شدت سے ہو رہا ہے یہاں تک کہ راشن کارڈ کے اجرا پر بھی۔

۷ ۔ پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے۔

۸ ۔ مداخلت واقعی ہو رہی ہے لیکن پارٹی کی حلقوں میں دسمبر کے بعد گھس آنے والے اقتدار پرست ایسا کر رہے ہیں جہاں تک کارکنوں کا سوال ہے وہ پہلے بھی آمریت کے سامنے تھے اور اب وڈیروں اور سرمایہ داروں کے سامنے ہیں اس لئے ہماری مداخلت کہیں بھی نہیں ہو رہی اور نہ ہو سکتی ہے۔

آئندہ شمارہ میں

پیپلز پارٹی کی تنظیم؟

عوام اور کارکن کیا کہتے ہیں؟

کے عنوان کے تحت

محمد کفیل احمد صدر پاکستان پیپلز پارٹی ناظم آباد (کراچی) اور چوہدری عبدالشکور خازن پیپلز پارٹی جنرل وپٹا میوالی کے تاثرات ملاحظہ فرمائیں۔ (ادارہ)

کیا ایک ڈی ایس پی فائرنگ کا حکم دے سکتا ہے؟ صفحہ ۸ سے آگے



انکار کر دیا۔ کراچی کی انتظامیہ نے بھی اپنے پریس نوٹ میں اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ ملز کی انتظامیہ نے نہ صرف تنخواہ دینے سے انکار کیا بلکہ "لے آف" کا نوٹس بھی لگا دیا۔ اپنی تنخواہ طلب کرنا کوئی جرم نہیں۔ یہ مزدوروں اور محنت کشوں کا بنیادی اور قانونی حق ہے لیکن ۷ جون کو صوبائی حکومت کراچی کی انتظامیہ اور پولیس نے محنت کشوں سے ان کا یہ قانونی حق بھی چھین لیا۔ وہ مجرم قرار دیئے گئے اور ڈی۔ ایس۔ پی نور خان نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے بغیر وارننگ دیئے مزدوروں پر بندوقوں کے دہانے کھول دیئے۔ حالانکہ ڈی ایس پی فائرنگ کا حکم نہیں دے سکتا۔ دوم یہ کہ فائرنگ سے پہلے وارننگ دینا ضروری ہے۔ سوم یہ کہ فائرنگ کرتے وقت پیروں اور ٹانگوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے لیکن نور خاں کی قیادت میں پولیس نے مزدوروں کے سینوں اور سروں کا نشانہ بنا کر فائرنگ کی۔ اور اپنے اس بھیانک جرم کو چھپانے کے لیے مزدوروں کی لاشیں بھی اپنے قبضے میں لے لیں۔

۸ جون کو بھی پولیس نے کسی جواز کے بغیر شہید شعیب کے جنازے پر فائرنگ کی اور جو مزدور اپنے شہید ساتھیوں کی لاشیں اٹھانے گئے وہ بھی فائرنگ کا نشانہ بن گئے۔ اس دن پولیس نے مزدوروں کا اس طرح شکار کھیلا جس طرح کوئی وڈیرہ بٹیروں۔ تیتروں اور پرندوں کا شکار کرتا ہے۔ اتنا بڑا قتل عام تو کبھی ایوبی دور میں بھی نہیں ہوا تھا اور نہ یحییٰ کے عہد میں! لیکن "عوامی حکومت" کے دور میں صوبائی حکومت نے جس طرح سرمایہ داروں کا ساتھ دیا۔ انتظامیہ اور پولیس کے بھیانک جرائم کی پردہ پوشی کی، وہ قابلِ مذمت ہے۔

جناب عثمان بلوچ سے جب صدر بھٹو کے اس بیان پر رائے پوچھی گئی کہ ———— "مزدوروں نے جان بوجھ کر گڑبڑ کی اور اس کا مقصد صدر بھٹو کے دورۂ مسلم ممالک اور دہلی کے مذاکرات کو ناکام بنانا تھا" یہ سوال سُن کر عثمان بلوچ کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک نے جنم لیا۔ انہوں نے کہا کہ قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک یہی الزام مزدوروں پر لگایا جاتا رہا ہے۔ غلام محمد، اسکندر مرزا کے زمانے میں بھی محنت کشوں کو غیر ملکی ایجنٹ کہا گیا۔ ایوب اور یحییٰ نے بھی انہیں ملک دشمن قرار دیا۔ اب پیپلز پارٹی بھی یہی کہہ رہی ہے کیونکہ اب تک ہر برسرِ اقتدار جماعت کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام کو قائم کرنا ہے۔ لیکن حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ مزدوروں پر ملک دشمنی اور غیر ملکی ایجنٹ کا الزام لگانے والے غلام محمد، اسکندر مرزا، ایوب اور یحییٰ خان خود غاصب تھے، ملک دشمن تھے اور بیرونی طاقتوں کے ایجنٹ تھے۔ انہوں نے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ملک

نئی لیبر پالیسی کو زندہ رکھنے کے لئے مزدوروں کا خون بہایا گیا

کو امریکہ کی گود میں ڈال دیا۔ پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آنے سے پہلے محنت کشوں مزدوروں اور کسانوں کو طاقت کا سرچشمہ کہا کرتی تھی اب انہیں غیر ملکی ایجنٹ اور ملک دشمن کہہ رہی ہے۔ تاریخ اس بات کا فیصلہ کرے گی کہ غیر ملکی ایجنٹ کون ہیں اور محبِ وطن کون ہیں۔ اگر مزدور غیر ملکی ایجنٹ ہیں تو کیا وہ سرمایہ دار محبِ وطن ہیں جنہوں نے "پک اک" سے قرضے لے کر ملز تعمیر کیے ہیں اور زرِ مبادلہ، جس کو صدر بھٹو نے "قوم کا خون" قرار دیا تھا بیرونِ ملک جمع کرا رکھا ہے اور حکومت کی دھمکیوں کے باوجود وہ واپس نہیں لائے۔ جناب عثمان بلوچ نے کہا کہ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ محنت کش طبقے نے کبھی اپنے وطن سے غداری نہیں کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں۔ میر جعفر، میر صادق محنت کش طبقے سے نہیں جاگیردار اور حکمران طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

نپولین بونا پارٹ کے زوال کا سبب محنت کش نہیں نپولین کے بھائی اور رشتہ دار تھے۔ انہیں اس نے مختلف ملکوں کا سربراہ بنایا تھا۔ جناب عثمان بلوچ نے کہا کہ مزدور تو اپنے وطن کے تحفظ اور بقا کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک وطن پر نچھاور کر دیتے ہیں۔ اسٹالن گراڈ کا معرکہ اس کی روشن مثال ہے۔

جناب عثمان بلوچ نے کہا کہ ۷ جون کی تحریک سے کچھ فائدے اور تجربات بھی ہوئے ہیں۔ فائدے یہ کہ ظالم اور مظلوم کی ایک واضح تفریق ہو گئی۔ اب ظالم ایک طرف ہیں مظلوم ایک طرف؛ دوست اور دشمن کی پہچان ہو گئی ہے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ سرمایہ دار سیاسی جماعتیں خواہ کتنے خوش کن اور مزدور دوستی کے نعرے لگائیں لیکن مزدوروں کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ تجربہ یہ ہوا کہ کتنی جانیں دینے کے بعد صرف ڈی ایس۔ پی، ایس۔ ایچ۔ او اور ایس آئی کے تبادلہ کا وعدہ کیا گیا ہے جب کہ یعقوب مسیح کی ہلاکت میں ملوث تھانے کے تمام افراد کو معطل کر دیا گیا تھا حالانکہ اس پر چوری کا الزام تھا پورے تھانے کی معطلی محض اس وجہ سے ہوئی کہ یعقوب مسیح کے پیچھے پوری سیاسی جماعت پیپلز پارٹی تھی۔ اگر مزدوروں کی پشت پر بھی کوئی سیاسی تنظیم ہوتی تو یقیناً زیادہ کامیابی ہوتی۔ اس لیے اب ایک ایسی سیاسی تنظیم کی اشد ضرورت ہے جو مزدور کسان سیاست پر یقین رکھتی ہو تاکہ وہ محنت کشوں کی رہنمائی کرے۔



قارئین کہتے ہیں

عوامی دور میں روٹی مانگنے پر گولی ملتی ہے

۱۱ جون اور ۱۲ جون ۷۲ء کو شعلے برساتی ہوئی گولیاں بچاسوں جسموں میں پیوست ہوگئیں اور یہ چلتے پھرتے چوڑے چکلے سینوں والے جسم چند منٹوں میں ساکت اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ لیکن ان بے جان جسموں کی جگہ چند نئے جسموں نے لے لی اور یہ عہد کیا کہ وہ ہمیشہ مظلوم طبقے کی حمایت میں سینہ سپر رہیں گے اور ان کی قربانیوں کو رائگاں نہیں ہونے دیں گے۔ یہ بے جان جسم کون تھے۔ یہ وہ بھوکے اور پھٹے حال لوگ تھے جنہوں نے اپنے پیٹ کے لئے روٹی اور تن کے لئے کپڑے کا مطالبہ کیا تو بجائے روٹی کے ان کو آگ برساتی ہوئی گولیاں انعام میں دی گئیں۔ یہ صرف مزدور تھے اور اپنے حقوق کے لئے مطالبہ کر رہے تھے۔ ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا اور جو صرف سوشلزم کے نام پر سیاست کے میدان میں نکل آئے۔ اس لئے کہ مزدوروں کو معلوم ہے کہ غیر طبقاتی سماج ہی میں ان کی ترقی اور بالادستی قائم ہو سکتی ہے۔ وہ ان آمروں، جابروں، سرمایہ داروں سے اپنا حق مانگ رہے تھے۔ جنہوں نے پچھلے ۲۵ سال سے ان کو لوٹا کھسوٹا۔ ان کا استحصال کیا اور ان پر اپنی بالادستی قائم رکھی اور آج بھی اس نوکر شاہی کے دور میں ان پر جور و ستم پہلے سے کہیں زیادہ شدت اختیار کر چکا ہے۔ اس غریب طبقے نے برسر اقتدار لوگوں کی گلی گلی کوچے کوچے اس لئے حمایت نہیں کی تھی کہ قائد عوام کی حکومت میں بھی ان کے ساتھ ظلم روا رکھا جائے،

قائدِ عوام! یہ ایوب شاہی دور کے چمچے، سرمایہ دار، جاگیردار، رجعت پسند اور بیورو کریٹ ذہن کی انتظامیہ آپ کی حکومت کو بدنام اور ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں مصروف ہے۔ آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں اور آپ مظلوم مزدور کسان عوام کے ساتھ میدانِ عمل میں آئیں جو اپنی ملک کی ترقی کے لئے ہر وقت کوشاں اور ملک کو خوش حال بنانے کے لئے زیادہ محنت کرتے ہیں۔

صدر صاحب! آپ کو محنت کش عوام نے اس لئے منتخب نہیں کیا تھا کہ آپ نوکر شاہی کے ہاتھوں ایسی لیبر و زرعی پالیسیاں بنائیں جن سے مزدور اور کسانوں کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچے۔ بڑے طبقے کے لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں۔ آپ تو یہ نعرے لگاتے اور اعلان کرتے تھے کہ "میں اس کی جو مشین کا پہیہ چلائے"، "زمین اس کی جو اس پر ہل چلائے"۔ پھر آج ایسی پالیسیاں کیوں؟ ان پالیسیوں سے تو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا حلقہ مزدوروں اور کسانوں کے گرد اور تنگ ہو گیا ہے۔ اس عوامی دور میں بھی وہی نعرے "کل بھی لاٹھی چلتی تھی"، "آج بھی لاٹھی چلتی ہے" "کل بھی ظلم ہوتا تھا"، "آج بھی ظلم ہوتا ہے"۔ "کل بھی گولی چلتی تھی" "آج بھی گولی چلتی ہے"۔ یہ نعرے تو پچھلے آمرانہ دورِ حکومت میں لگا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوکر شاہی، افسر شاہی اور بیورو کریسی نے اب بھی اپنی جڑیں مضبوطی سے قائم کی ہوئی ہیں۔ جو انہوں نے مزدوروں پر وہی ظلم روا رکھا ہے۔ اور اگر یہ مزید ظلم جاری رہا تو یہ مزدور گولیاں ضرور کھائیں گے۔ جانوں کی قربانیاں ضرور دیں گے۔ مگر بالآخر لوٹ کھسوٹ کے اس نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔

صدر صاحب!

آپ ان سرمایہ داروں، جاگیرداروں، وڈیروں، لٹیروں، عیاشوں، نوکر شاہی کے ایجنٹوں اور محلاتی سازشیں کرنے والوں سے ہوشیار رہیں جو پہلے بھی ملک کے ٹکڑے ٹکڑے اور اس کو خطرات سے دو چار کر چکے ہیں اور اب بھی ملک کے مزید ٹکڑے کرنے کے درپے ہیں۔

آج کا مزدور جاگ اٹھا ہے اور اتنا شعور رکھتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو کبھی بھی ان کے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دے گا۔

(جاوید بخچی - کراچی)

●

فوجی ٹولے کی عیاشی کی سزا عوام کیوں بھگتیں؟

مشرقی پاکستان میں آج جو کچھ بھی ہو رہا ہے اور اس سے پہلے جو کچھ وہاں کے باشندوں پر بیت چکا ہے وہ سب ہمارے سامنے ہے۔ آج ہم اپنی اس منزل سے بھی بہت دور جا چکے ہیں جہاں سے ہم نے قائدِ اعظم کی رہنمائی میں اپنے ابتدائی سفر کا آغاز کیا تھا۔

آج ہمارے اکثریتی علاقے پر بھارت کا غاصبانہ قبضہ ہے شاید خدا کو ایسا ہی منظور ہو۔ لیکن ساتھیو اور محنت کشو! ہمت ہارنے کی کوئی بات نہیں ہے اب بھی ہم اپنے ملک کی خاطر بہت کچھ کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔

اب ہمیں ایک نئے اور خوشحال پاکستان کی ایک نئے عزم کے ساتھ تعمیر کرنا ہے، ایسا پاکستان بنانا ہے جس میں غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کا استحصال نہ ہو ایسا مضبوط پاکستان جس کا نقشہ اور تصور قائدِ اعظم کے ذہن میں تھا۔

ہم بہت ٹھوکریں کھا چکے ہیں اور بہت قربانیاں دے چکے ہیں۔ اب ہمیں ایک خوشحال پاکستان کے لیے قربانیاں دینا ہوں گی۔ شاید یہی قربانیاں پاکستان کے غیور عوام کا مقدر بن چکی ہے۔

سابقہ فوجی حکمران ٹولے کی حکومت کی عیاشی نے ملک کو تباہ و برباد کر دیا ہے جس کی سزا ہم غریب اور محنت کش عوام کب تک سہتے رہیں گے۔ ان کی غلط خارجہ پالیسی کی

وجہ سے آج ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی سے الگ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یحییٰ ٹولے نے پاکستان کے وقار کو ہر طرح سے نقصان پہنچایا۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا کا تقریباً ہر ملک یحییٰ خان کی فوجی حکومت کے خلاف تھا اس لیے خاص طور پر یہی وجہ تھی کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے مقابلے میں اس بار ہمیں بہت کم بیرونی امداد اور حمایت حاصل ہوئی۔ اس غدار فوجی ٹولے کی غلط خارجہ پالیسی کی وجہ سے باہر بھی پاکستان کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔

پاکستان کی سابقہ فوجی حکومتوں نے مشرقی پاکستان کے کسی سیاسی لیڈر کو کوئی عزت نہیں بخشی۔ کسی لیڈر کو انہوں نے غدّار بنایا اور کسی کو باغی اور خونی اور کسی کو دشمن کا ایجنٹ قرار دے کر ان کے دلوں میں پاکستان کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکائی اور انہیں گرفتار کر کے جیلوں میں دھکیل دیا۔

ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ غریبوں اور مزدوروں کا استحصال کرنے والے ان بڑے بڑے سرمایہ داروں نے بھی آج ملک کے ایک بازو کو دوسرے بازو سے الگ کرنے پر مجبور کیا ہے۔ انہی کی وجہ سے غیّور بنگالیوں کو اپنی پستی کا احساس ہوا۔ ان لٹیرے سرمایہ داروں نے ملک کے مغربی حصے کے ساتھ ساتھ مشرقی بازو میں بھی کارخانوں پر اپنا تسلّط جمائے رکھا۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ان بائیس مالدار سرمایہ داروں میں کوئی بنگالی مسلمان بھی شامل ہے؟

شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب بنگالی مسلمان ہو جن کا کوئی چھوٹا موٹا کارخانہ مشرقی پاکستان میں چل رہا ہو ان ہی لوگوں کی سازشوں سے آج ملک کی یہ حالت ہوئی ہے لیکن اب تو حالت ہی کچھ اور ہے۔ ماضی کی غلطیوں کی سزا آج ہم سب ایک ساتھ بھگت رہے ہیں۔ کاش! کہ ایسا نہ ہوتا۔

(ذوالفقار علی غافل، کراچی)

سبق سیکھئے

پانچ اور دس روپے کے نوٹ بھی اچانک گئے۔ اچھا ہوا ——— کیونکہ بنگلہ دیش سے پاکستانی کرنسی بڑی تعداد میں پاکستان اسمگل کی جارہی تھی جس کا مقصد ہماری قومی معیشت کو تباہ کرنا تھا۔ پانچ اور دس کے نوٹوں کی منسوخی سے جہاں پاکستانی کرنسی کی اسمگلنگ کا سدِ باب ہو گیا وہاں غریب عوام کو دو دنوں تک بڑی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ نوٹوں کی منسوخی کے اعلان کے ساتھ ہی پانچ اور دس روپے کے نوٹوں کا لین دین بند ہو گیا حالانکہ حکومت نے واضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ پیر کے دن یعنی ۵ جون ۱۹۷۲ء سے تمام بنکوں کے ذریعے نئے نوٹ جاری کر دیئے جائیں گے۔

ہفتے کے دن میں نے کئی آدمیوں کو بحالتِ مجبوری لسبیلا سے نارتھ ناظم آباد اور نئی کراچی تک پیدل مارچ کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ بہت چھوٹا سا واقعہ ہے مگر اس سے ہمارے قومی مزاج کا تعین ہوتا ہے۔ مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد نے اگر سنگین بحران کے زمانے میں صبر و ضبط سے کام نہ لیا تو شاید ہم ایک قوم کی حیثیت سے کبھی نہ ابھر سکیں۔

(صغیر الحسن، نارتھ ناظم آباد کراچی)

جماعتِ اسلامی کے ہاتھوں اردو کا قتلِ عام؛ صفحہ ۶ سے آگے

مجموعی پیپلز پارٹی پر پڑ رہا ہے۔ جو پہلے ہی ایک ڈھیلی ڈھالی سیاسی جماعت تھی، اور جس کے لئے تنظیمِ نو کی شدید ضرورت تھی۔

پارٹی کے سیکرٹری جنرل جے اے رحیم اس کی تنظیمِ نو کا بیڑہ اٹھا کر کراچی آئے۔ مگر یہ کیسی تنظیمِ نو ہو گی۔ اس کا اندازہ کراچی کی تنظیمِ نو سے ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ تمام سطحوں پر عہدیداروں کے انتخابات کرائے جاتے۔ پارٹی کو اس طرح عوام کے قریب لایا جاتا لیکن ہوا کیا۔ وہی نامزدگی کا طریقِ کار۔ رحیم صاحب نے جسے چاہا آنکھ بند کر کے کوئی نہ کوئی عہدہ عطا کر دیا۔

مولانا کوثر نیازی لائلپور کے ضمنی انتخابات میں کامیابی کے بعد پیپلز پارٹی میں خاصے طاقت ور سمجھے جاتے ہیں۔ بائیں بازو کے عناصر سے پارٹی کو ہٹا کر دائیں بازو کی جماعتوں، خصوصیت کے ساتھ جماعت اسلامی سے قریب تر کر دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ پارٹی کو انتخابات میں انہی عناصر نے کامیاب بنایا۔ اس کی کامیابی کے لئے انتھک کام کیا۔ بے غرض خدمت کی، جیلیں کاٹیں، پولیس کا ظلم و تشدد سہا اور مولانا کوثر نیازی پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد آپ اسے جماعت اسلامی کا "جدید ایڈیشن" بنانے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ اسلامی سوشلزم کا نعرہ تبدیل کر کے جماعت اسلامی کا نعرہ اسلامی مساوات اختیار کر لیا گیا۔ جمہوریت کے گلے پر پہلے ہی مختلف طریقوں سے چھری پھیری جا چکی ہے۔ لے دے کے اسلام ہمارے پاس رہ گیا۔ یہ نعرہ جماعت اسلامی کا بھی ہے۔ اندرا گاندھی سے دہلی میں مذاکرات کے سلسلہ میں مشورہ کے لئے اگر بلایا جاتا ہے تو اسلام پسندوں کو خواہ وہ طلباء ہوں۔ دانش ور یا سیاست دان، غرضیکہ دائیں بازو سے قربتیں قریب ہوتی جارہی ہیں اور بائیں بازو سے فاصلے طویل تر ہوتے جارہے ہیں۔

پیپلز پارٹی میں بائیں سے دائیں جانب مڑنے کے اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ مزدوروں میں بے چینی پھیل رہی ہے۔ کسانوں میں بد دلی ہے۔ طالب علموں میں کشیدگی ہے۔ دانشوروں میں بیزاری ہے۔ ایک ایک کر کے وہ تمام طبقات جنہوں نے پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا تھا۔ جو اپنی جد و جہد کے ذریعے اُسے برسرِ اقتدار لائے تھے۔ اس سے کٹتے جارہے ہیں اور پیپلز پارٹی جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کی آغوش میں پناہ لے رہی ہے۔

یہ ایک خطرناک علامت ہے۔ اس میں پیپلز پارٹی ہی کی نہیں ملک کی تباہی کے آثار صاف نظر آرہے ہیں۔ ان خطرات کو محنت کش عوام نے سمجھ لیا ہے۔ اور کراچی کی فائرنگ کے بعد ثابت کر دیا کہ تشدد اور ظلم کے ذریعے انہیں دبایا نہیں جا سکتا۔ ان میں نئی قوت اور نیا عزم پیدا ہو رہا ہے۔ وہ محنت کش عوام کے خلاف جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ وہ اپنی جد و جہد کو تیز سے تیز کریں گے۔ حالات یہی بتا رہے ہیں۔ مستقبل کا یہی فیصلہ ہے۔

بقیہ: نئے مرکزی ٹیکس

پانچ پیسے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اب سرچارج کی نئی شرح دس سگریٹوں کے پیکٹ پر دس پیسے، پندرہ پیسے اور بیس پیسے ہو گی۔ بیس پیسے تک کے سگریٹ حسبِ سابق ڈیوٹی سے مستثنیٰ ہوں گے۔

(۲۳) مشروبات پر ڈیوٹی کی شرح دس پیسے فی بوتل ہو گی۔

(۲۴) سوتی پارچہ بافی کے چار پاور لومز ڈیوٹی سے مستثنیٰ ہوں گے جبکہ ماضی میں صرف دو پاور لومز ڈیوٹی سے مستثنیٰ تھے۔

ششم: کسٹمز

(۲۵) ٹیرف کی شرحوں میں مبادلہ کی اصلاحات کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر نظرِ ثانی کی گئی ہے۔ جو نقائص علم میں آئے ہیں انہیں دور کیا جا رہا ہے۔

(۲۶) درآمد شدہ شراب پر درآمدی ڈیوٹی میں پچاس فیصد اضافہ کیا جا رہا ہے۔

بقیہ : افسانہ

بولے۔

" چلیے اس کو اٹھا کر گھر لے چلتے ہیں۔ اس کے گھر والے بیچارے نا' نوم کتنے بے چین ہوں گے ؛" مرزا صاحب نے کہا اور چاروں آدمیوں نے لاش اٹھالی۔ جب یہ لوگ لاش اٹھاکر لے گئے تو پولیس بھی وہاں پہنچ گئی۔ جگہ کو دیکھا اور واپس چلی گئی۔ صدیقی صاحب لاش کو اٹھائے ہوئے آدمیوں کے آگے آگے جب فیض کے گھر میں داخل ہوئے تو فیض کی بہن دوڑتی ہوئی آئی صدیقی صاحب کے گلے لگ گئی۔ اور بولی ——— "چچا جان ! میرے بھائی جان کو تلاش کرلائیں وہ ابھی تک نہیں آئے۔ آج تو ہم ان سے کوئی شکایت نہیں کریں گے ہم فاقہ ہی کرلیں گے مگر وہ گھر تو آجائیں، ہم کب کہتے ہیں کہ اس میں ان کا قصور ہے یہ تو ہمارے مقدر کی بات ہے ہم انہیں کوئی الزام نہیں دیں گے ..... ؛" لڑکی بول رہی تھی اور صدیقی صاحب رو رہے تھے۔ بولتے بولتے اچانک وہ چپ ہوگئی۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ زرد چہرہ اور بھی زرد ہوگیا۔ لاش کو اٹھائے ہوئے آدمی اندر آگئے تھے۔ لڑکی دوڑی اور ماں سے لپٹ گئی۔

دوسرے دن اخبار کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی خبر لگی ہوئی تھی ——— "بے کار نوجوان کی موت سے ماں کا ہارٹ فیل ہوگیا اور بہن پاگل ہوگئی، لڑکی کو پاگل خانے بھیج دیا گیا ؛" اور اسی اخبار کے سامنے والے صفحے پر اسی لیڈر کی بہت بڑی تقریر چھپی ہوئی تھی۔

بقیہ : اداریہ

لیکن پولیس فائرنگ نے ثابت کر دیا کہ نوکر شاہی اور حکمران جاگیردار اپنے اتحادی سرمایہ دار کو ہر قیمت پر یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ اس کے مفادات کا تحفظ کیا جائے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ۔ امریکہ سے ملنے والی امداد اور سرمایے کے تحفظ اور ضمانت کے لئے عملی طور پر یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ اس ملک میں بائیں بازو اور مزدوروں کی تحریک کو کچلنے کی ابتدا ہو چکی ہے لہذا سامراجیو بڑھو اور اس ملک کو اپنی ہی نوآبادی سمجھو۔

اب پیپلز پارٹی کا طبقاتی کردار واضح اور کھل کر سامنے آگیا ہے۔ عوام ان کو پہچاننے لگے ہیں۔ مزید پہچاننے لگیں گے۔ ان میں پائی جانے والی مایوسی اس کا ثبوت ہے۔ وہ نیپ اور پیپلز پارٹی سے جو امیدیں وابستہ کر چکے تھے اُن کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔ سامراجیوں کے براہ راست ایجنٹ اس صورت حال کو اپنے لئے سازگار بنانے کی فکر میں ہیں۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ مگر عوام کا شعور بہت بلند ہو چکا ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس نظام سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ایک ایسی تنظیم کی اشد ضرورت ہے جو سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کو نیست و نابود کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو۔ یہ تنظیم مزدوروں کی قیادت میں کسانوں کے اتحاد، طلبہ اور مظلوم طبقے کی حمایت سے ہی قائم ہو سکتی ہے۔

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
22. JUNE - 29 JUNE 1972